سعادت حسن منٹو

اپنی تخلیقات کی روشنی میں

(ایک نفسیاتی تجزیہ)

مصنّف

پروفیسر محمد محسن

ناشر

دارالاشاعت ترقی دہلی

اشاعت ۱۹۸۲ء
تعداد ایک ہزار
قیمت مجلّد ۳۰ روپے غیر مجلّد ۲۳ روپے
مطبوعہ سپر پرنٹرس دہلی-۶

ترتیب

"منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم
کا نتیجہ ہے۔ اس کے والد خدا بخشے بڑے
سخت گیر تھے اور اس کی والدہ نہایت رحم دل۔
ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانہ گندم کس
شکل سے باہر نکلا ہوگا اس کا اندازہ آپ
کر سکتے ہیں۔"

منٹو۔ خودنوشت خاکہ۔

پیش لفظ

کسی فن کار کی تخلیقات کی بنیاد پر اُس کی خارجی اور داخلی شخصیت کا ڈھانچہ تیار کرنے کی روایت اُردو میں نہیں پائی جاتی۔ انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں اس طرح کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں۔ منٹو اُردو کا صرف ایک عظیم افسانہ نگار نہیں تھا۔ وہ عدیم المثال تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس بنا پر اگر اُسے جینیس کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جینیس کی شخصیت محض غیر معمولی نہیں ہوتی بلکہ عام شخصیتوں سے مختلف ہونے کی وجہ سے ابنارمل (غیر عمومی) بھی سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے جینیس کو بذات خود ایک نوع باور کیا جاتا ہے۔ منجملہ اس کے دوسرے اور اوصاف کے جینیس کی شخصیت بہت متنوع ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت کے گوناگوں پہلو ہوتے ہیں۔ اکثر اُن کے اندر ربط وضبط اور توازن کا نشان نہیں ملتا۔ منٹو کی شخصیت پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو اُس کے اندر بھی ہمیں حیرت انگیز تضاد، الجھاؤ اور بے ربطی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور بادی النظر میں اس کی شخصیت ہمیں ایک معمہ نظر آتی ہے۔ بالکل اسی طرح ناقابلِ فہم جیسی ایک ذہنی مریض کی شخصیت ہوتی ہے۔ اُس کے مرض کی علامتوں میں بھی ویسی ہی بے ربطی اور نظم وضبط کا فقدان پایا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ جینیس کے کردار اور مجنونانہ کیفیت میں حدفاصل کی لکیر نہایت مدھم ہوتی ہے۔ منٹو کی شخصیت کی بوقلمونی، بے ربطی اور تضاد نے ہی راقم کو نفسیات کے اصول وضوابط کے تحت اُس کی شخصیت کے تجزیے کی ترغیب دی۔ چنانچہ میں اُس کی تخلیقات کا اس نظر سے مطالعہ کرنے لگا کہ اُن کے داخلی عوامل تک رسائی حاصل کر کے منٹو کی شخصیت کی گتھی کو سلجھا سکوں۔ ہم شخصیت کے داخلی عوامل تک براہِ راست نہیں پہونچ سکتے۔ اُس کے مظاہروں کا سہارا ضروری ہو جاتا ہے جس کی شخصیت کے فہم کی ہمیں فکر ہوتی ہے اُس کے ظاہری فعل وعمل اور طور طریقوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ فنی تخلیقات، خواہ اُن کا تعلق کسی فن سے ہو، فن کار کی شخصیت کو سمجھنے میں اُس کے دوسرے فعل سے کم اہم نہیں ہوتیں۔ خصوصاً جس فن کار کی

حیثیت جینیس کی ہوتی ہے۔ جینیس کی تخلیقات میں بے ساختہ پن اور ایک اضطراری کیفیت کا عمل ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ اپنی شخصیت کے اظہار میں اس احتیاط سے کام نہیں لیتا جو عام فن کار کا خاصہ ہوتا ہے۔ عام فن کار دوسرے لوگوں کی طرح اپنے کو مروجہ اور قابل قبول سانچوں میں ڈھالنے کا میلان رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح اپنی انفرادیت پر نقاب ڈال لیتے ہیں۔ جینیس کو اس کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی خاص اور جداگانہ ڈگر پر گامزن ہوتا ہے۔ چنانچہ جینیس کی تخلیقات اُس کی ذات کی جس طرح آئینہ داری کرتی ہیں اس کی مثال عام فن کاروں میں نہیں مل سکتی۔

مجھے امید ہے کہ میرے قاری اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں گے کہ منٹو کی شخصیت کے تجزیے سے اُس کی عظمت پر کسی طرح کی آنچ آجائے گی۔ بلکہ اس کی انفرادیت اور انوکھا پن اور زیادہ اُجاگر ہو کر اُسے اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ اونچے مقام پر پہونچا دے گا۔ مشہور ماہر نفسیات، سگمنڈ فرائڈ نے جب لیونارڈو ڈاونچی کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کا عزم کیا تو اُسے بھی یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اُس کی یہ کوشش اس کے قاری کو غلط فہمی کا شکار نہ بنا دے۔ لیونارڈو ڈاونچی اُن عدیم المثال صلاحیتوں کا مالک تھا جن کا کسی ایک ہی شخص کے اندر موجود ہونا ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ وہ پندرہویں صدی کا ایک ممتاز موسیقار، مصور، انجینئر اور فلکیات، علم نباتات، علم کیمیا اور علم تشریح کا ماہر تھا۔ اس کی مصوری کا شاہکار 'مونا لیزا' آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کی فوٹو کاپی کتنے لوگوں کے ڈرائنگ روم کی آج بھی زینت بنی ہوئی ہے۔ بقول فرائڈ لیونارڈو ڈاونچی ایک ہمہ جہتی جینیس تھا جس کی ذات کے متعلق کافی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں لیکن اس کی گہرائیوں تک نہیں پہونچا جا سکا ہے۔ ایسی عظیم شخصیت کا تجزیہ کبھی اس کا وہ مقام چھین نہیں سکتا جو دنیا اُسے دے چکی ہے۔ اس سلسلے میں فرائڈ کا یہ قول ہے کہ جب ایک نفسیات تحلیلی کا ماہر جس کا تعلق عام طور پر مریضانہ شخصیتوں سے ہوتا ہے کسی عظیم شخصیت کو تجزیہ کا موضوع بناتا ہے تو اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ اس کی شخصیت کی تابناکیوں پر سیاہ دھبے لگا دے۔ اور اس طرح اُس کی شخصیت پر خاک ڈال کر اسے ملیامیٹ کر دے۔ البتہ ایک ماہر تحلیل نفسی کو اس بات کا یقین ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، ہم اسے انھیں سائنسی اصول و ضوابط کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں جن کا اطلاق ہم دوسری شخصیتوں کے فہم کے لیے کرتے ہیں۔ فرائڈ کا یہ قول منٹو کی شخصیت کے تجزیے پر بھی صادق آتا ہے۔

اس کتاب کا تقریباً سارا مواد راقم نے منٹو کی تخلیقات سے ہی اخذ کیا ہے۔ اُس کے افسانے، اُس کے خاکوں کے دو مجموعے، 'گنجے فرشتے اور لاؤڈ سپیکر' اور اس کے ادبی مضامین کا مجموعہ۔ منٹو کی موت کے بعد خصوصاً نقوش کے منٹو نمبر میں جو مضامین منٹو کے فن اور شخصیت کے بارے میں شائع ہوئے تھے اُن سے بھی اک گونہ فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ اپنے ہر بیان کی سند کے لیے میں نے ان سارے مآخذوں سے اقتباسات بھی نقل کر دیے ہیں۔ منٹو کی شخصیت کے سلسلے میں جو نفسیاتی حقائق پیش کیے گئے ہیں، جہاں تک ممکن ہو سکا ہے انھیں غیر تکنکی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی میں قاری سے گزارش کروں گا کہ ان کا بغور مطالعہ کر کے اُن نکات کو ذہن نشیں کر لیں جن کی وضاحت کی گئی ہے۔ ورنہ وہ اس تجزیے کی معقولیت کو کماحقہ پرکھ نہ سکیں گے۔

میں نہیں جانتا میری یہ کوشش کس حد تک کامیاب سمجھی جائے گی اور قاری کا اس پر کیا اور کیسا ردِ عمل ہوگا؟ بہر حال میں یہ سوچ کر مطمئن ہوں کہ کم از کم میری یہ کوشش اُردو زبان کے لیے پیشرو کی حیثیت ضرور رکھتی ہے۔

محمد محسن
دار الامان پٹنہ
بہار

منٹو کے خاندانی حالات

سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالا، ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوا۔ اس کے آبا و اجداد کشمیر سے آکر یہاں بس گئے تھے۔ منٹو کا آبائی مکان کوچہ وکیلان، امرتسر میں تھا۔ منٹو کے والد غلام حسن، منصف تھے۔ بعد میں شاید جج ہو گئے تھے۔ منٹو نے ' مہر درخشاں ' میں ان کا جج ہونا بتایا ہے۔ ابوسعید قریشی نے جو منٹو کا بچپن کا دوست تھا۔ انہیں منصف ہی کہا ہے (رحم دل دہشت پسند)۔ ابوسعید قریشی نے منٹو کے والد کی ایک بڑی سی تصویر کا ذکر کیا ہے جو اس کمرے میں آویزاں تھی جس کا نام باری علیگ نے دارالاحمر رکھ دیا تھا۔ منٹو نے اپنے مضامین میں اس کمرے کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔ منٹو کے والد کی تصویر کی تفصیل ابوسعید قریشی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "بند کالر کوٹ، سر پر کشمیری وضع کی پگڑی، خشخشی داڑھی، بڑی بڑی خشمگین نگاہیں، یوں لگتا جیسے ہمارے مشاغل کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں شاید ان کی غضب آلود نگاہوں کی زد سے بچنے کے لیے ہی سعادت بھاگ کر ایک بار بمبئی چلا گیا تھا۔ وہ ان دنوں میٹرک میں فیل ہو گیا تھا۔" بقول منٹو کی بہن، ناصرہ اقبال، کے "جان خطا ہوتی تھی۔ اس کی میاں جی کے ڈر سے۔ پتنگ اڑا رہا تھا ایک دن کوٹھے پر میاں جی آ گئے۔ اتنے میں باہر کی چھت سے کود پڑا یہ برابر کے کوٹھے پر۔ چوٹ آئی۔ مگر کیا مجال جو سی تک کی ہو" (رحم دل دہشت پسند)۔ منٹو کے بیان کے مطابق "خدا انہیں بخشے۔ بڑے سخت گیر تھے" (خود نوشت خاکہ) منٹو نے ان کی سخت گیری کا ذکر ایک دوسری جگہ اس طرح کیا ہے: "تین چار بیشہ ور لفنگوں کے ساتھ مل کر ہم نے ایک ڈرامٹنگ کلب کھولی تھی۔ آغا حشر کا ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ کلب صرف پندرہ بیس روز قائم رہ سکی تھی۔ اس لیے کہ والد صاحب نے ایک روز دھاوا بول کر ہارمونیم طبلے سب توڑ پھوڑ دیئے تھے اور واضح الفاظ

میں ہم کو یہ بتادیا تھا کہ ایسے واہیات کھیل انہیں بالکل پسند نہیں ،، (آغا حشر کشمیری سے دو ملاقاتیں) منٹو کے والد اس پر کڑی نگرانی رکھتے تھے جس کا ثبوت منٹو کے اس بیان سے ملتا ہے " آغا صاحب کا کوئی ڈرامہ دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے کہ رات کو گھر سے باہر رہنے کی مجھے قطعاً اجازت نہیں تھی " (آغا حشر کشمیری سے دو ملاقاتیں)۔

منٹو کے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے انہیں تین لڑکے تھے جن کی تعلیم ولایت میں ہوئی تھی۔ وہ منٹو سے عمر میں بہت بڑے تھے (خود نوشت خاکہ) منٹو اپنے بھائیوں کے بارے میں خود نوشت خاکے میں لکھتا ہے " ان سے اسے کبھی ملاقات کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ اس لیے کہ وہ سوتیلے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملیں۔ اس سے بڑے بھائیوں کا برتاؤ کریں "۔ ان میں سے دو بھائیوں کا ذکر منٹو نے اپنے افسانے " رام کھلاون " میں کیا ہے۔ سعید حسن اور محمد حسن۔ یہ دونوں بھائی بیرسٹر تھے۔ انہوں نے دو سال بمبئی میں پریکٹس کرنے کے بعد جزیرہ فجی میں پریکٹس شروع کردی محمد حسن داڑھی رکھتے تھے اور انہیں حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی تھی (لذت سنگ)۔ سعید حسن بیرسٹر ایک عرصے کے بعد جزائر فجی سے امرتسر جاتے ہوئے بمبئی میں رکے تھے۔ منٹو ان دنوں بمبئی میں تھا انہوں نے اسے ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔ منٹو نے ان کے ٹھہرنے کا انتظام اس فلیٹ میں کر دیا تھا جہاں نذیر لدھیانوی اور شوکت حسین رضوی، خاندان فلم کے ڈائرکٹر، رہتے تھے۔ نذیر لدھیانوی مصور ہفتہ وار کے مالک تھے۔ منٹو ان دنوں مصور کو ایڈٹ کر رہا تھا۔ خود منٹو کلیر روڈ میں جس فلیٹ میں رہتا تھا وہ بہت چھوٹا تھا۔ نذیر کے فلیٹ میں ایک علیحدہ کمرے اور غسل خانے کا انتظام آسانی سے ہو سکتا تھا۔ سعید حسن اس فلیٹ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے ان کے قیام کے دوران شوکت حسین رضوی نے ایک رات اپنے چند دوستوں کی دعوت کی۔ یہ سب کے سب فلم کمپنی سے منسلک تھے۔ اس دعوت میں منٹو اور اس کی بیوی بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد منٹو اور اس کی بیوی گھر چلے گئے۔ اس رات سعید حسن شوکت علی کے بیٹے زاہد کے یہاں مدعو تھے۔ وہ دیر سے لوٹے۔ " جب انہوں نے ہال میں قدم رکھا تو دیکھا کہ رندی و سرمستی اپنے بال کھولے ناچ رہی ہے۔ وہ ہائے ہوئے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی "۔ وہ صبح اٹھتے ہی اپنا سامان بندھوا کر خلافت ہاؤس چلے گئے۔ منٹو کے دوستوں کو انہوں نے اس قدر تیز و تند لہجے میں برا بھلا کہا، کہ منٹو جب اس واقعہ کو یاد کرتا ہے تو

اسے "یوں محسوس ہوتا ہے کہ" اس کے "کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اتر آیا ہے" (نور جہاں)

منٹو کی والدہ اس کے والد کی دوسری بیوی تھیں۔ وہ انہیں بی بی جان کہا کرتا تھا۔ منٹو کے اپنے بیان کے مطابق وہ "بے حد نرم دل تھیں" (خود نوشت خاکہ) منٹو نے اپنی تحریروں میں ان کا ذکر بہت کم کیا ہے۔ وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ "باری علیگ کو جب نماز پڑھنی ہوتی تو بی بی جان کو آواز دیتے اور پانی کا لوٹا اور جائے نماز منگوا لیتے" (باری صاحب) اپنی شادی کے سلسلے میں منٹو نے اپنی ماں کا نہایت ضمنی طور سے، ذکر کیا ہے۔ "شادی ٹھیک ہو چکی تھی۔ اس وقت اس کے گھر میں سوائے اس کی والدہ کے اور کوئی نہ تھا۔ فلم انڈسٹری کے تمام آدمی آ رہے تھے۔ ان کی خاطر داری کون کرتا۔ ایک ضعیف عورت بے چاری کیا کر سکتی تھی" (بابو راؤ پٹیل)۔

احمد ندیم قاسمی کے نام اپنے خط مورخہ ۲۶ر جون ۱۹۳۹ء میں منٹو لکھتا ہے "کرشن چندر کو اتنا ضرور لکھ دو کہ مری ماں مر چکی ہے۔ اس کا ماتم کرنے سے جو مجھے فرصت ملتی ہے وہ میں ان کے حوالہ کر دوں گا (منٹو کی چند یادیں اور خطوط)۔ کرشن چندر نے منٹو سے ایک نیا افسانہ لکھ کر بھیجنے کی فرمائش کی تھی۔ غالباً منٹو کے والد کا انتقال انہی دنوں ہو چکا تھا، جب منٹو امرتسر کے ایک کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ اس سے پہلے تعلیم کی غرض سے وہ علیگڑھ بھی گیا تھا۔ (شاعر منٹو نمبر)۔ اس وقت اس کے والد اس کی پڑھائی کا خرچ پورا کر رہے ہوں گے۔ غالباً والد کے انتقال کی وجہ سے اسے علیگڑھ چھوڑنا پڑا اور اس نے انٹرمیڈیٹ میں امرتسر کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ والد کے مرنے کے بعد بقرینۂ غالب منٹو کی والدہ تا حیات اس کے ساتھ رہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے نام اس خط میں منٹو نے اپنی بیوی صفیہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ اس وقت ایک بچے کی ماں ہو چکی تھی۔ اس اعتبار سے منٹو کی شادی ۱۹۳۸ء میں ہوئی ہو گی۔ بابو راؤ پٹیل سے منٹو کی ملاقات ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی جب وہ بمبئی میں سینے ٹون فلم کمپنی میں ملازم تھا اور بابو راؤ کی مداخلت پر فلم کے مالک نے منٹو کی ایک سال کی تنخواہ کے بارہ سو روپیوں میں آٹھ سو ادا کیے تھے۔ اس رقم کو منٹو نے اپنی شادی کے موقع پر خرچ کیا تھا۔ (بابو راؤ پٹیل)۔ منٹو کا ایک جگہ اور بیان ہے کہ وہ "شادی کے دو برس بعد دلی چلا گیا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہا" (رام کھلاون)۔ دلی وہ ۱۹۴۰ء میں گیا تھا۔ ان باتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ منٹو کی شادی کے بعد اس کی ماں ایک

برس زندہ رہیں۔

اپنی سگی بہن ناصرہ اقبال کا ذکر منٹو نے صرف ایک جگہ کیا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ رفیق غزنوی اینگلیٹو منیشن کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ "اس کے سامنے میری بہن رہتی تھی" (رفیق غزنوی)۔ باوجود بمبئی میں مقیم ہونے کے منٹو کی بہن اس کی شادی میں شریک نہ تھی۔ یہ منٹو کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس کی شادی کے موقع پر اس کے گھر میں سوائے اس کی ماں کے کوئی اور نہ تھا۔ منٹو بہن سے ڈرتا تھا۔ اس کا اقبال خود منٹو نے احمد ندیم قاسمی سے کیا تھا (منٹو کی چند یادیں اور خطوط)

منٹو کی ابتدائی زندگی

منٹو کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے سے دل چسپی نہیں تھی۔ جب اسکول میں تھا تو بقول خود تین چار پیشہ ور لفنگوں کے ساتھ مل کر ایک ڈرامٹنگ کلب کھولا تھا۔ "نتیجہ یہ ہوا کہ دو بار میٹرک میں فیل ہوا"۔ اپنے خود نوشت خاکے میں اپنے قاری کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ "آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ اُردو کے پرچے میں ناکام رہا"۔ آخر تیسری بار پاس ہوا تو امرتسر کالج میں ایف اے میں داخلہ لیا۔ ایف اے میں بھی دو بار فیل ہونے کے بعد پڑھنے سے اس کا جی اچاٹ ہوگیا اور وہ "کٹرہ جمیل سنگھ میں دینو یا فضلو کمہار کی دکان پر جو بیٹھک جوا کھیلنے والوں کی ہوتی" اس میں شریک رہا کرتا۔ جوئے سے اس کی دل چسپی اتنی زیادہ ہوگئی تھی "کہ رات کو جو تھوڑی بہت فرصت سونے کی ملتی تھی اس میں بھی خواب راؤنڈ رن اور ترپلون ہی کے آتے تھے"۔ بعد میں جوئے سے بھی اس کی طبیعت اکتا گئی اور اس نے بیٹھک میں جانا آہستہ آہستہ چھوڑ دیا (آغا حشر سے دو ملاقاتیں)

امرتسر میں جیجے کے ہوٹل شیراز میں منٹو کی روز کی بیٹھک رہا کرتی تھی۔ وہیں اس کی ملاقات باری علیگ اور ابو العلا چشتی الصحافی (حاجی لق لق) سے ہوگئی۔ امرتسر میں غازی عبدالرحمن نے ایک روزانہ پرچہ، مساوات، جاری کیا تھا۔ اس کی ادارت ان دونوں کے سپرد تھی ہنوز بہت جلد باری صاحب کے ساتھ گھل مل گیا تھا"۔ ان کی سنجیدگی اور متانت بھری ظرافت" منٹو کو بہت پسند آئی" اس کے" ذہنی انتشار کو بھانپ کر" باری صاحب نے اسے" صحافت کی طرف مائل کیا" اور آہستہ آہستہ اُردو سے روشناس کیا"۔ منٹو کا وقت" جو پہلے فلش کھیلنے میں کٹتا تھا اب مساوات کے دفتر میں کٹنے لگا"۔ باری صاحب کبھی کبھی مساوات کے لیے

خبروں کا ترجمہ منٹو سے کرانے لگے۔ بعد میں فلمی خبروں کا ایک کالم انہوں نے اس کے سپرد کر دیا۔ (باری صاحب) باری صاحب کی صحبت میں منٹو کو مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا وہ پہلے ہیں تیر تھ رام فیروز پوری کا ناول پڑھا کرتا تھا۔ اب باری صاحب کی وجہ سے آسکر وائلڈ اور وکٹر ہیو گو میرے زیر مطالعہ رہنے لگے " (اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں)۔ بقول سعید قریشی۔ جو منٹو کے بچپن کے ساتھی تھے " باری علیگ کی صحبت میں آکر منٹو ان کا مرید بن گیا تھا اور اس کے کمرے میں فلمی ستاروں کی بجائے ادب و انقلاب زیر بحث تھے۔ کمرے کی فضا ایکٹروں کے قصیدوں کی بجائے والٹیر، روسو، مارکس، لینن، ٹراٹسکی، اسٹالن، گورکی کے تذکروں سے گونجتی تھی۔ (رحم دل دہشت پسند)۔ باری صاحب کی فرمائش پر منٹو نے وکٹر ہیو گو کی پوری کتاب (Last Days of A condemned) کا ترجمہ سرگذشت اسیر کے نام سے " دس پندرہ دن کے اندر ڈکشنری سامنے رکھ کر " کر ڈالا۔ باری صاحب نے بہت پسند کیا۔ اس کی اصلاح کی۔ یعقوب حسن، مالک اُردو بک اسٹال نے باری صاحب کے ذریعہ خرید کر اسے شائع کر دیا۔ بقول خود منٹو اب " صاحب کتاب بن گیا۔" آغا حشر سے منٹو کی دوسری ملاقات باری صاحب کے ساتھ لاہور میں یعقوب حسن کے اُردو بک اسٹال میں ہوئی۔ پہلی ملاقات منٹو کے ایک دوست ہری سنگھ نے کرادی تھی اس وقت آغا حشر امرتسر آئے ہوئے تھے۔ آغا حشر اُردو بک اسٹال میں سرگذشت اسیر پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے جو کتابیں خریدی تھیں ان میں سرگذشت اسیر بھی تھی۔ آغا حشر منٹو کو بھول چکے تھے۔ باری صاحب نے آغا حشر سے منٹو کا تعارف اس کتاب کے مترجم کی حیثیت سے کرایا۔ منٹو نے آغا حشر کو اپنے آٹوگراف کی کاپی پیش کی۔ آغا حشر نے دستخط کر دیئے۔ جس کی تاریخ ۲۶ را پریل ۱۹۳۴ء تھی۔ (آغا حشر سے دو ملاقاتیں) سرگذشت اسیر کی اشاعت کے بعد، منٹو نے آسکر وائلڈ کے اشتراکی ڈرامے ویرا کا ترجمہ شروع کر دیا۔ ان ہی دنوں، اختر شیرانی، آٹھ دس دنوں کے لیے امرتسر آئے ہوئے تھے اور جیجے کے ہوٹل شیراز میں مقیم تھے۔ وہیں منٹو کی اُن سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اختر شیرانی کی شراب و شاعری کی صحبتوں میں منٹو کی روز شرکت ہوتی رہی۔ کچھ دنوں کے بعد منٹو اختر شیرانی سے لاہور میں ملا اور ویرا کا مسودہ بغرض اصلاح انہیں پیش کیا۔ اختر شیرانی نے یہ کہہ کر منٹو کے حوالہ کر دیا کہ " ترجمہ بہت اچھا ہے۔ کہیں کہیں زبان کی اغلاط تھیں۔ وہ میں نے درست کر دی ہیں۔" اختر شیرانی نے مسودہ پر اپنے دستخط بھی کر دیئے جس کی تاریخ ۱۸ر نومبر ۱۹۳۴ء تھی (اختر

شیرازی سے چند ملاقاتیں) ویرا کا ترجمہ منٹو نے خود شاتی برقی پریس میں چھپوا دیا۔ " یہ ڈرامہ روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کی سرگرمیوں کے متعلق تھا۔ " (باری صاحب) باری صاحب کے مشورے سے منٹو، حسن عباس اور سعید قریشی نے مل کر اس کو امرتسر میں اسٹیج کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور امرتسر کی دیواروں پر اس کا اشتہار چسپاں کرنا شروع کر دیا۔ " اشتہار چسپاں کرنے کے بعد میں اور عباس دونوں رات بھر گرفتار ہو جانے کی سنسنی کے ساتھ آدھے سوتے آدھے جاگتے رہے۔ امرتسر کی دیواروں پر زاریت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والے اشتہار کچھ تو اکھڑ گئے اور کچھ قوت مردی کی دواؤں کے پوسٹروں کے تلے دب گئے۔ " (باری صاحب) پولس نے جو ان اشتہاروں کو دیکھا تو ان لوگوں کی دھڑ پکڑ کی انہیں فکر ہونے لگی۔ لیکن " خورجہ عبدالحمید، ریٹائرڈ ڈی۔ ایس۔ پی، نے پولیس کے سفید پوشوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ تو اپنے بچے ہیں میاں۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ اور بلا ٹل گئی۔ " اگر پولیس نے بچوں کے اس کھیل کا اپنی روز جیسی تندہی سے ساتھ تعاقب کیا ہوتا تو منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی سب صلاحیتیں موجود تھیں۔ " (رحم دل دہشت پسند)۔ منٹو کا یہ بیان اس کی ابتدا سے باغیانہ فطرت کی ترجمانی کرتا ہے " میں اور حسن عباس نئے نئے باغی نہیں تھے۔ دسویں جماعت میں دنیا کا نقشہ نکال کر ہم کئی بار خشکی کے راستے سے روس پہونچنے کی اسکیم بنا چکے تھے۔ ہم نے امرتسر کو ماسکو تصور کر لیا تھا اور اس کی گلی کوچوں میں مستبد اور جابر حکم رانوں کا عبرت ناک انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں اسی زمانے میں پھانسی پا گئے ہوتے اور امرتسر کی خونی تاریخ میں ایسے شہیدوں کا اضافہ ہو گیا ہوتا جو اب خلوص دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رُخ کا بھی صحیح علم نہیں تھا۔ " (باری صاحب)

باری صاحب مساوات سے علیحدہ ہو کر خلق سے منسلک ہو گئے۔ خلق کے پہلے شمارے میں منٹو کا سب سے پہلا طبع زاد افسانہ " تماشہ " شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعت پر منٹو اپنا تاثر اس طرح پیش کرتا ہے۔ " خلق کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو میں اور عباس یوں محسوس کرتے تھے جیسے ہم سے کوئی بڑا کارنامہ سرزد ہو گیا ہے۔ کٹڑہ جمیل سنگھ اور ہال بازار میں ہم ایک نئی شان سے چلتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ہمیں محسوس ہوا کہ امرتسر کی نظروں میں ہم ویسے کے ویسے آوارہ گرد ہیں۔ پان سگریٹ والے بدستور اپنے پیسوں کا تقاضا کرتے اور خاندان کے بزرگ برابر اپنا وہی فیصلہ سناتے تھے کہ ہمارے لچھن اچھے نہیں ہیں " (باری صاحب)۔ اس کے بعد منٹو

نے مختلف اخباروں میں لکھنا شروع کر دیا۔

منٹو کو ادب سے دل چسپی پیدا کرانے میں باری علیگ کا ہاتھ تھا۔ منٹو اس کا خلوص دل سے معترف ہے۔ "آج کل میں جو کچھ ہوں اس کے بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ اگر امرتسر میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے ان کی صحبت میں گذارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا۔" (اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں) باری صاحب پر اپنے خاکے میں بھی منٹو باری صاحب کے احسانات کا شدت سے ساتھ اظہار کرتا ہے۔ "مرحوم کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ ان کو مجھ پر ناز بھی تھا۔ مگر اس کا اظہار انہوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کیا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی سے اس انداز سے کہا کہ منٹو میرا بنایا ہوا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مجھے تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے وہی تھے۔ اگر امرتسر میں ان سے ملاقات نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ میں ایک غیر معروف آدمی کی حیثیت سے مر کھپ گیا ہوتا یا چوری ڈکیتی کے جرم میں لمبی سزا کاٹ رہا ہوتا"۔ (باری صاحب)

منٹو کی فلمی دُنیا سے وابستگی

غالباً ۱۹۳۵ء میں منٹو بمبئی چلا گیا۔ وہ اس وقت "افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا۔ ترجمہ کا دور لاہور میں ختم ہو چکا تھا۔" اس نے طبع زاد افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے جو مقبول ہوئے۔ ادبی حلقوں میں منٹو کا تعارف ہو چکا تھا۔ "اردو ادب سے دل چسپی رکھنے والے مجھے جاننے لگے تھے۔ دیر تک اخباروں کی جھک مارنے کے بعد فلمی دنیا میں داخل ہوا۔ یہاں بھی ایک دو برس جھک مارنی پڑی۔" (رفیق غزنوی) بمبئی میں منٹو کو پہلی ملازمت ہفتہ وار پارس میں ملی۔ اس کے مالک کرم چند تھے "تنخواہ چالیس روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ مگر ایک مہینے میں بمشکل دس پندرہ روپے ملتے تھے۔" (چراغ علی حسرت)۔ اس کے بعد منٹو چالیس روپے ماہوار پر ہفتہ وار مصور کا ایڈیٹر ہو گیا۔ اس کے مالک نذیر لدھیانوی تھے۔ انہیں دنوں منٹو نے ہمایوں اور عالم گیر کے روسی ادب نمبر مرتب کیے تھے۔ (چراغ علی حسرت)

منٹو شروع شروع بمبئی آیا تو نو روپے ماہوار کی ایک کھولی میں رہتا تھا "جس میں پانی کا نل تھا نہ بجلی۔ ایک نہایت ہی غلیظ کوٹھری تھی جس کی چھت پر سے ہزار کھٹمل میرے اوپر گرتے تھے۔ چوہوں کی کافی بہتات تھی" (پیرن)۔ یہ کھولی فارس روڈ کے علاقے کی ایک گلی میں واقع تھی "فارس روڈ اس پورے علاقے سے منسوب تھا جہاں بیسوائیں بستی تھیں۔ اس میں کئی گلیاں تھیں۔ ان میں سینکڑوں جنگلہ لگی دکانیں تھیں جن میں مختلف رنگ و سن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم بیچتی تھیں" (محمد بھائی)۔ مصور سے منسلک ہونے کے بعد منٹو نذیر لدھیانوی کے ساتھ ۱۷ اڈلفی چیمبر کلیر روڈ میں رہنے لگا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد منٹو کو امپیریل فلم کمپنی میں ساٹھ روپے ماہوار پر منشی کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ وہاں وہ "ڈائرکٹروں کے حکم کے مطابق الٹی سیدھی زبان میں فلموں

کے مکالمے لکھتا رہا۔" یہاں ایک سال ملازمت کی۔ تنخواہ چار ماہ کی باقی تھی کہ کمپنی کا دیوالہ پٹ گیا۔ یہاں سے سروج فلم کمپنی میں چلا گیا۔ وہ بھی بند ہونے والی تھی کہ اس کے مالک نانو بھائی ڈیسائی نے ایک دوسری فلم کمپنی سینے ٹون کھول دی۔ یہاں منٹو سو روپے پر ملازم ہوا۔ اور ایک سال کام کرتا رہا۔ اس درمیان میں منٹو کا نکاح ہوگیا۔ سال بھر کی تنخواہ باقی تھی۔ سیٹھ نے ادا کرنے سے انکار کردیا۔ "تو تو میں میں شروع ہوئی"، تو سیٹھ نے منٹو کو کمپنی سے باہر نکال دیا۔ منٹو نے بڑی سبکی محسوس کی "میری عزت پر یہ صاف حملہ تھا۔ میرا وقار بالکل مٹی میں مل گیا تھا۔" بابو راؤ فلم انڈیا کا ایڈیٹر تھا۔ نذیر لدھیانوی نے ۱۹۳۸ء میں منٹو سے اس کا تعارف کرادیا تھا۔ بابو راؤ نے نانو بھائی ڈیسائی کے اسٹوڈیو میں جاکر "بارہ سو کا فیصلہ آٹھ سو میں کرادیا" (بابو راؤ پٹیل)۔ منٹو سے نذیر لدھیانوی کی ان بن ہوگئی۔ "کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ نذیر نے میری بے لوث خدمت اور دوستی کو ٹھکرادیا۔" منٹو مصور سے علحدہ ہوگیا لیکن نذیر کے ساتھ ایک ہی فلیٹ میں رہا اور فلیٹ کا کرایہ نذیر ادا کرتا رہا۔ بابو راؤ پٹیل اردو کا ایک ہفتہ وار اخبار 'کارواں' بھی نکالتا تھا۔ منٹو کو بابو راؤ کے یہاں ملازمت مل گئی بابو راؤ نے تنخواہ ڈیڑھ سو روپے مقرر کرنی چاہی لیکن منٹو نے ساٹھ روپے پر ہی کام کرنا مناسب سمجھا تاکہ وقت کی سختی سے پابندی نہ کرنی پڑے۔ (بابو راؤ پٹیل)

بمبئی کے دوران قیام میں منٹو نے ریڈیو کے لیے لکھنا شروع کردیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اسے آل انڈیا ریڈیو دلی میں ملازمت مل گئی۔ اور وہ بمبئی چھوڑ کر دلی چلا آیا۔ منٹو نے بمبئی چھوڑنے کی وجہ بس اتنی ہی بتائی ہے کہ "کئی برس بمبئی کی فلمی دنیا میں رہ کر چند وجوہ کی بنا پر دل برداشتہ ہوکر دلی چلا آیا۔" ڈیڑھ سال کے بعد منٹو بمبئی واپس آگیا۔ دلی چھوڑنے کی وجہ منٹو کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھی کہ "بمبئی سے مصور کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی کے متعدد خط آئے کہ تم واپس چلے آؤ۔ خاندان کے ڈائرکٹر شوکت حسین رضوی یہاں آئے ہوئے ہیں اور میرے پاس ٹھہرے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ان کے لیے ایک کہانی لکھو۔ میں دہلی چھوڑ کر چلا گیا۔" (نور جہاں)۔ لیکن اپندر ناتھ اشک کے بیان کے مطابق منٹو اس کی سازش کا شکار ہوگیا تھا۔ (منٹو میرا دشمن)۔ منٹو جب آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوا تو اس وقت کرشن چندر اور ن۔ م راشد بھی اس سے منسلک تھے۔ بعد میں اپندر ناتھ اشک بھی کرشن چندر کے بلاوے پر آل انڈیا ریڈیو دلی میں ملازم ہوگیا۔ منٹو کا افسانہ خوشیا جب ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء

میں شائع ہوا تو راجندر سنگھ بیدی نے اشک سے اس کے متعلق رائے پوچھی تھی۔ اشک نے کہہ دیا تھا کہ " وہ کوڑی کی کہانی ہے "۔ بیدی کی جب منٹو سے ملاقات ہوئی تو یہ بات بیدی نے منٹو تک پہونچادی۔ اشک جب آل انڈیا ریڈیو دلی میں آیا تو منٹو اس کے متعلق کوئی نہ کوئی مضحکہ آمیز ریمارک پاس کرتا رہتا۔ کچھ دن پہلے منٹو کی کہانی دھواں شائع ہوئی تھی۔ منٹو نے اس کے متعلق اشک کی رائے پوچھی تو اس نے کہہ دیا کہ " اچھی ہے۔ اب تم چھٹی پر لکھو "۔ بقول اشک منٹو اسے تین دن تک گالیاں دیتا رہا۔ اشک انتقام لینے کی فکر میں تھا۔ راشد سے بھی منٹو کی چشمک تھی۔ اتفاقاً راشد پروگرام ایگزیکٹو ہوگیا۔ انہی دنوں ہندی کا ایک نیا پروگرام اسسٹنٹ ڈولی، بھی آل انڈیا ریڈیو میں داخل ہوا۔ راشد اور ڈولی کو سازش میں شریک کرکے اشک نے منٹو کے لکھے ہوئے ایک ریڈیو ڈرامہ کو ایڈٹ کر دیا اُس پر بھری میٹنگ میں تنقید کی گئی۔ یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔ آپس میں جھڑ جھپٹ ہوئی۔ بات بڑھ جاتی لیکن شور سُن کر اسٹیشن ڈائرکٹر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آگئے اور طے ہوا کہ ڈرامہ تصحیح شدہ صورت میں نشر ہوگا۔" منٹو میٹنگ کے بعد دفتر سے نکل گیا۔ تصحیح شدہ ڈرامہ اس نے واپس منگوالیا اور پانچ چھ دنوں کے بعد دلی چھوڑ کر بمبئی چلاگیا۔ (منٹو میرا دشمن)۔ منٹو نے خود اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن منٹو کے اس بیان سے کہ " یہاں سے بھی دل اُچاٹ ہوگیا " (نور جہاں) اس کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔

بمبئی آکر منٹو شوکت کے لیے کہانی لکھنے میں لگ گیا۔ کہانی کا نام "نوکر" تجویز ہوا تھا۔ فلم نوکر کا پروڈکشن شروع ہوگیا۔ منٹو نے فلم کا مکمل منظرنامہ معہ مکالموں کے لکھ کر دے دیا تھا۔ لیکن شوکت دوسروں سے بھی اس فلم کا مکالمہ لکھوا رہا تھا۔ کہانی میں بھی شوکت نے ترمیم کردی تھی۔ منٹو آہستہ آہستہ علیحدہ ہوگیا (نور جہاں)۔ منٹو کو سو روپے کی تنخواہ پر فلمستان میں مکالمہ نگار کی جگہ مل گئی۔ فلم کمپنی کا مالک ایس مکرجی پہلے ہمانشو رائے کی بمبئی ٹاکیز میں مسٹر ساوک، واچا، ساؤنڈ انجینیر، کا اسسٹنٹ تھا اشوک کمار، ایس مکرجی کا سالا تھا۔ اس کے ذریعہ اشوک کمار کو بھی بمبئی ٹاکیز میں ملازمت مل گئی تھی۔ پھر جب ایس مکرجی نے اپنا فلمی ادارہ فلمستان قائم کیا تو واچا اور اشوک کمار بھی وہاں آگئے۔ فلمستان میں ایک مکالمہ نویس کی جگہ خالی ہوئی۔ منٹو نے اپندر ناتھ اشک کو فلمستان میں کام کرنے کے لیے دلی سے بلایا تو پہلی بار اشک نے جانے سے انکار کردیا تھا۔ لیکن منٹو نے اسے تار دیا کہ وہ انٹرویو کے لیے آئے۔ چنانچہ اشک

نے فیصلہ کرلیا۔ اور پونے سات سو روپے تنخواہ پر اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ لیکن یہاں بھی دونوں میں ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ منٹو فلمستان کے مالک، ایس مکرجی کے ناک کا بال بنا ہوا تھا۔" اشک کو گمان تھا کہ اس سے انتقام لینے کے لیے منٹو نے فلمستان میں اُسے نوکری دلوادی تھی۔" مجھے دوستوں نے بتایا کہ منٹو تمہارے مکالمے کے پرخچے اڑا دے گا۔ تم تنخواہ ضرور اچھی پاؤ گے۔ لیکن تمہاری جان ضیق میں آجائے گی۔" اشوک کمار نے اشک کو ایک کہانی لکھنے کو کہا۔ اشک فلمستان میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ اس لیے کہانی کا علیحدہ معاوضے کے لیے اشوک سے اس نے دو ہزار کی رقم طلب کی۔ منٹو کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بلامعاوضہ کہانی لکھنے پر راضی ہوگیا۔ اور "اچھی خاصی سازش کرکے اشک کا پتہ کاٹ دیا۔" اشک منٹو سے انتقام لینے کی فکر میں لگ گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے منٹو سے "بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی"۔ فلم "آٹھ دن" تیار ہورہی تھی۔ پنڈت طوطا رام کا ایک مذاحیہ رول تھا، اس کا جو مکالمہ منٹو لکھتا اشک اس میں کافی ترمیم کردیتا۔ "منٹو ایک دن اتنا پریشان ہوا کہ سیٹ پر ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔" اس فلم کا ڈائرکٹر دتارام پائی مقرر ہوا تھا۔ اشک نے پائی کو ساتھ ملالیا تھا۔ چنانچہ اس کا ترمیم کردہ مکالمہ ہی پائی منظور کرنے لگا۔ منٹو تنگ آکر فلمستان سے علحدہ ہوگیا۔ اور بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اشوک کمار نے واچا کے ساتھ مل کر بمبئی ٹاکیز کو جو نہایت ابتر حالت میں تھا خرید لیا تھا اور فلمستان سے علیحدہ ہوگیا تھا۔

منٹو جب بمبئی ٹاکیز میں داخل ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہوچکے تھے۔ بمبئی ٹاکیز میں سب کلیدی آسامیاں مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں۔ ہندو کارکنوں کے اندر ساوک اور

اشوک کمار کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھر رہے تھے۔ منٹو خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ "اشوک کمار اور واچا میرے دوست تھے۔ وہ مجھ سے مشورے لیتے تھے اس لیے کہ ان کو میرے خلوص پر بھروسہ تھا۔ میں سوچتا تھا کہ بمبئی ٹاکیز کو کچھ ہوگیا تو اشوک کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" ایک شام کو اشوک کمار منٹو کو اس کے فلیٹ پہونچانے کے لیے ایک مسلمان محلہ سے گذرا تو فسادیوں نے اس کی موٹر کار کو گھیر لیا۔ منٹو بے حد خائف ہوا لیکن "دو نوجوانوں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے کہا۔ اشوک بھائی آگل رستہ نہیں ملے گا۔ ادھر باجو سے چلے جاؤ۔" منٹو فساد سے متاثر تھا ہی، چند روز بعد نذیر احمد اجمیری کی کہانی پر جو 'مجبور' کے نام سے قلم بند ہوئی اس نے "نکتہ چینی کی اور اس میں کچھ تبدیلیاں کرنی چاہیں تو نذیر احمد نے اشوک اور واچا سے کہا کہ منٹو کو آپ ایسے مباحثوں میں نہ بٹھایا کریں۔ وہ چونکہ خود افسانہ نویس ہے اسی لیے

متعصب ہے ۔" میں نے بہت غور کیا ۔ کچھ سمجھ نہ آیا ۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا۔ منٹو بھائی اگلی رستہ نہیں ملے گا ۔ کار موٹر روک لو ۔ ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ ۔ اور میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا گیا " (اشوک کمار)

اپندر ناتھ اشک نے منٹو کے بمبئی چھوڑنے کی وجہ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے ۔ " منٹو کے بد دل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کمال امروہی کی ۔ جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتہ چلا منٹو نے بمبئی چھوڑ دیا ۔" (منٹو میرا دشمن) ۔ عصمت کا بیان بھی اشک کی اس توجیہ کی توثیق کرتا ہے ۔ عصمت کی کہانی "ضدی" اور کمال امروہی کی کہانی "محل" بن گئی اور منٹو کی کہانی اشوک کمار کو پسند نہ آئی ۔ وہ رہ گئی ۔ منٹو کو اس کی امید نہ تھی اور اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی " (منٹو میرا دوست میرا دشمن) وہ پاکستان چلا گیا ۔

منٹو کی زندگی کا آخری دور

ہندوستان کی آزادی کے دو ہی تین ماہ بعد منٹو پاکستان چلا گیا تھا۔ پاکستان پہنچ کر منٹو پر جو کچھ گذری اس کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہاں بھی اسے اچھے دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ پاکستان کے رسالہ میں جب منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" شائع ہوا تو اس پر فحش نگاری کے الزام میں مقدمہ چلنے لگا جس کی وجہ سے اسے بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ "میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبون حالی اور اپنے افسانے ٹھنڈا گوشت کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ عدالت ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین مہینے قید مشقت اور تین سو روپے جرمانہ کی سزا دی تھی" (مرلی کی دھن)۔ منٹو پاکستان چلا گیا تو عصمت چغتائی برابر اس کی خبر لیتی رہی۔ ابتدا میں اسے معلوم ہوا کہ "منٹو بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوب صورت۔ قیمتی سامان سے آراستہ۔ پھر سنا کہ مکان چھن گیا۔ مگر دوسرا مکان خاصا اچھا ہے"۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد پاکستان کے حالات سے منٹو کو بیزاری ہونے لگی۔ عصمت کو اس نے لکھا:۔ "کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو"۔ جو پذیرائی منٹو کی ابتدا میں ہوئی تھی وہ جلد ہی ناقدری میں بدل گئی۔ جب اسے ٹھنڈا گوشت والے مقدمہ میں سزا ہو گئی تو "کسی نے بھی احتجاج نہیں کیا۔ بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا جذبہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ ہی جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں۔ نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔ پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا۔ اور پاگل خانے میں یار دوست پہونچا آئے ہیں"۔ (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔

منٹو پاگل خانے میں تھا جب اپنے عزیز ترین دوست شیام کی موت کی خبر اس

نے اخبار میں پڑھی۔ منٹو پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیر علاج تھا۔ منٹو اپنی اس وقت کی دماغی کیفیت کا اس طرح بیان کرتا ہے "ان دنوں ایک عجیب و غریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک چکر میں پھنسا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوشمندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہونچتا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈ مڈ ہو گئی تھیں کہ خود کو 'نومینز لینڈ' میں بھٹکتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی تو ساتھ والے کمرے کے پاگل سے کہا 'جانتے ہو میرا ایک دوست مر گیا" (مرلی کی دُھن)۔

شیام کے منٹو پر بڑے احسانات تھے۔ وہ ایک معروف فلم ایکٹر تھا اور اس کی اچھی خاصی کمائی تھی۔ جب منٹو بمبئی میں تھا تو شیام اپنی کمائی کے روپے اس کے ساتھ مل کر بے دریغ خرچ کرتا تھا۔ پاکستان میں بھی اس نے کسی ذریعے سے منٹو کا پتہ دریافت کر کے اسے پانچ سو روپے بھیجے تھے۔ ان باتوں کا ذکر منٹو نے اپنے خاکے مرلی کی دھن میں کیا ہے۔ شیام اپنی فلم کی نمائش کے سلسلے میں امرتسر سے لاہور آیا ہوا تھا۔ منٹو سے وہ بڑی محبت سے ملا۔ اور جب تک وہاں رہا منٹو کو اپنے ساتھ ساتھ رہنے کی ترغیب دیتا رہا۔ لیکن شیام کی جو خاطر داری اور آؤ بھگت وہاں ہو رہی تھی منٹو کو اچھی نہیں لگی اور وہ اس سے کتراتا رہا۔ شیام کے ساتھ وقت گذارنے کا وعدہ کر کے "شیام کو اور فلمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو دل ہی دل میں موٹی موٹی گالیاں" دیتا ہوا گھر چلا گیا "رات بھر اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا۔ شیام سے کئی مرتبہ لڑائی ہوئی"، "کہہ رہا تھا "تم بالکل بدل گئے ہو..... کمینے ذلیل تم ہندو ہو"" (مرلی کی دُھن) منٹو کے ان سادے بیانات سے ظاہر ہے کہ وہ پاکستان میں اپنی بد حالی کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہار چکا تھا۔ اس پر قنوطیت طاری تھی اور وہ دماغی توازن کھو چکا تھا۔

منٹو کی حالت پاکستان میں بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ " پاکستان سے آنے والے لوگوں سے ایسی کڑوی خبریں سنیں کہ جی اوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں۔ پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں۔" (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ آخری زندگی میں اخبار والے اس سے دو تین افسانے روز لکھوانے لگے تھے۔ (شاعر منٹو نمبر)

کثرت شراب نوشی کی وجہ سے منٹو کو سوراسس اوف لیور کی شکایت ہو گئی تھی جس

کے علاج کے سلسلے میں وہ " میو ہسپتال میں ڈاکٹر پیرزادہ کے علاج میں تھا" (چراغ علی حسرت)۔ مرنے کے دو سال پہلے وہ بے تحاشا پی رہا تھا۔ شراب سے اس کا جگر چھلنی ہوگیا تھا۔ "۱۹۵۳ء کے آخر میں وہ مرتے مرتے بچا۔ ڈاکٹروں نے اسے معجزہ سمجھا۔ اور کہا دو سال بعد اگر اب بھی نہیں چھوڑی تو .... لیکن اس نے پھر بوتل کو منہ لگا لیا۔ گلاس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی" (رحم دل دہشت پسند) سعید قریشی جب آخری بار منٹو سے ملے تو وہ انہیں پہچان نہ سکا۔ اس کی بہن نے کہا " سعادت سعید آیا ہے) "میری نظر گلاس پر پڑ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کیا سوچ رہا ہوں۔ لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا" ٹھیک ہے یار۔ سب ٹھیک ہے۔ بکواس مت کر "اس کی پھٹی پھٹی گلابی آنکھیں گلا کر رہی تھیں۔ "تو بھی ناصح ہو گیا۔ اس کمبخت سے بھاگ کر تو میں نے یہاں پناہ لی ہے۔ تجھ سے بہتر سلوک کی توقع تھی" (رحم دل دہشت پسند)

۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء کی شام کو منٹو دیر سے گھر لوٹا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے خون کی قے کی۔ اس کے بھانجے، حامد جلال کے چھ سالہ لڑکے نے دیکھا تو اس نے اس کی تسلی یہ کہہ کر کر دی کہ پان کی پیک تھی اور کسی سے اس کا ذکر کرنے کو منع کر دیا۔ گھر والوں کو خبر ہوتی تو ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ " رات میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ صبح میں ڈاکٹر آیا تو اسپتال جانے کا مشورہ دیا۔ اسپتال کا نام سن کر وہ بول اٹھے اب بہت دیر ہو چکی ہے مجھے اسپتال نہ لے جاؤ۔ یہیں سکون سے پڑا رہنے دو" گھر کی عورتوں نے رونا شروع کر دیا تو یہ دیکھ کر " منٹو ماموں مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے غضب ناک آواز میں کہا۔ خبردار جو کوئی رویا، یہ کہہ کر انہوں نے اپنا منہ رضائی سے بند کر لیا۔ اسپتال لے جانے کو ایمبولنس آنے سے پہلے انہوں نے کہا " مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے اتنی سردی شاید قبر میں بھی نہیں لگے گی۔ میرے اوپر رضائی ڈال دو" تھوڑی دیر بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ انہوں نے آہستہ سے کہا " میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے لگا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو...... ، شراب منگوا دی گئی۔ انہوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور کہنے لگے۔ " میرے لیے دو پیگ بنا دو، اور یہ کہتے ہوئے وہ اور شدید تشنج کے باعث کانپ اٹھے۔ منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت اپنے لیے رحم کا کوئی شائبہ نہ موجود تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آ پہنچا ہے۔ لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے اپنے اوپر جذباتیت نہیں طاری

ہونے دی۔ انہوں نے اپنے بچوں اور بہن کو بھی اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ نگاہ واپسیں یا وصیت کے بھی قائل نہ تھے۔ ایمبولنس جیسے ہی دروازہ پر آکر کھڑی ہوئی انہوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چمچہ وہسکی اُن کے منہ میں ڈال دی گئی۔ لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق کے نیچے اترسکا ہوگا۔ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی۔ اور ان پر غشی طاری ہوگئی" (منٹو میرے ماموں) ہاسپتال پہونچنے سے پہلے منٹو جان بحق ہوچکا تھا۔

شاعر کے منٹو نمبر میں ادارہ شاعر نے منٹو کی اجمالی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں اس کتبے کی نقل شامل ہے جو منٹو نے ۱۸؍اگست ۱۹۵۴ء کو راولپنڈی میں ظفر زبیری کی آٹوگراف پر لکھ دیا تھا۔

۷۸۶

کتبہ

"یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا"

سعادت حسن منٹو
۱۸؍اگست ۱۹۵۴ء

اس کے ٹھیک پانچ مہینہ بعد اُردو کا یہ عظیم افسانہ نگار صرف تینتالیس سال کی عمر میں ۱۸؍جنوری ۱۹۵۵ء کو دنیا سے رخصت ہوگیا۔

منٹو کی ازدواجی زندگی

اپنی شادی کے بارے میں منٹو کا کوئی تفصیلی بیان نہیں ملتا۔ اپنے افسانے 'رام کھلاون' میں منٹو نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ " میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے ماہم جا رہا تھا۔" رام کھلاون دھوبی منٹو کے کپڑے دھویا کرتا تھا۔ منٹو اسی کے انتظار میں تھا۔ چونکہ منٹو کپڑے کی دھلائی وقت پر ادا نہیں کرتا تھا اس لیے اسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ " میری نادہندگی سے تنگ آ کر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت نہ کر دے اور مجھے شادی کی بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصہ لینا پڑے۔ جو کہ ظاہر ہے بہت ہی معیوب بات ہوتی " (رام کھلاون)۔ رام کھلاون کپڑے وقت پر لے آیا اور منٹو شادی کی بات چیت میں شریک ہونے کے لیے ماہم چلا گیا۔" بات چیت کامیاب رہی " نکاح پہلے ہو جانے کا ذکر منٹو نے کیا ہے (بابو راؤ پٹیل) لیکن شادی کے بارے میں اتنا کہہ کر نکل جاتا ہے " میری شادی عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ کچھ ایسے قصے تھے کہ میرے گھر میں سوائے میری والدہ کے کوئی اور نہ تھا۔ فلم انڈسٹریز کے تمام آدمی آ رہے تھے۔ ان کی خاطر داری کون کرتا۔ ایک ضعیف عورت بیچاری کیا کر سکتی تھی "۔ وہ قصے کیا تھے؟ شادی منٹو نے چوری چھپے نہیں کی۔ اپنی حیثیت کی مناسبت سے اس نے شادی حوصلے سے کی تھی۔ فلم انڈسٹریز کے تمام آدمیوں کو بلایا تھا۔ انتظام کے سلسلے میں منٹو کو پریشانی تھی۔ بابو راؤ کو کسی سے معلوم ہو گیا کہ منٹو پریشان ہے تو اس نے اپنی حسین و رنگین ملکہ پدما دیوی کو بھیج دیا کہ میری والدہ کا ہاتھ بٹائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پدما دیوی نے میری بیوی کو زیور وغیرہ بھی دیا تھا " (بابو راؤ پٹیل)۔ اس سے زیادہ منٹو نے اپنی کسی

تحریر میں اپنی شادی کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ اس کی بیوی صفیہ کا کس گھرانے سے تعلق تھا؟ صفیہ کے والدین کہاں کے رہنے والے تھے؟ شادی کرنے کا خیال منٹو کے دل میں خود پیدا ہوا یا اس نے اپنی ماں کی رضا جوئی کیلئے شادی کا فیصلہ کیا؟ صفیہ کا انتخاب اس نے خود کیا تھا یا اپنی ماں کی پسند پر چھوڑا تھا؟ یہ ساری باتیں منٹو نے صیغہ راز میں رکھیں ہیں۔

شادی کے ایک سال بعد منٹو کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کو وہ اپنے خط مورخہ ۳ر جون ۱۹۳۹ء میں لکھتا ہے "صفیہ بہ صحت ہے۔ آداب عرض کرتی ہے۔ اس وقت سامنے بیٹھی دودھ بنا رہی ہے بچے کے لیے" اسی خط میں منٹو نے اپنی ماں کے مرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ منٹو جب دلی میں ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت میں تھا تو اس کا لڑکا مر گیا۔ اس کا اسے بہت زیادہ غم ہوا تھا۔ منٹو کو یہ بچہ بہت عزیز تھا۔ عصمت چغتائی سے اس کا ذکر آگیا تو کہنے لگا وہ "آپ یقین کیجئے چھ سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سلانے لگا۔ میں اسے خود تیل مل کر نہلاتا تھا۔ تین مہینے کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو بس پڑی سوتی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلوا لیتا۔ اُسے خبر بھی نہ ہوتی" (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ اس بچے کی موت کے بعد منٹو کے تین بیٹیاں ہوئیں۔

منٹو کی خانگی زندگی نہایت خوشگوار تھی۔ "وہ ایک شریف بیوی کا وفادار شوہر تھا اور تین بچیوں کا شفیق باپ" (شاعر منٹو نمبر)۔ وہ اپنی بیوی سے بے پایاں محبت کرتا تھا۔ اور اس کی دلداری میں لگا رہتا تھا۔ دوستوں سے ملنے جاتا تو اکثر بیوی کو بھی ساتھ لے جاتا۔ عصمت چغتائی کی منٹو سے پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ جب وہ دلی ریڈیو اسٹیشن سے علیحدہ ہو کر بمبئی واپس آگیا تھا۔ اس وقت تک صفیہ دلی ہی میں تھی۔ عصمت سے بار بار صفیہ کا ذکر کرتا رہا۔ "جتنی دیر ہم بیٹھے رہے منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔ صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔ آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ چلتے چلتے اس نے پھر کہا صفیہ آنے والی ہے۔ بس جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر" (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔

منٹو کو بیوی کی رضامندی کا بڑا خیال تھا۔ صفیہ اسے شراب پینے سے روکتی تھی۔ اور جب اس نے محسوس کیا کہ منٹو شراب بالکل ترک نہیں کر سکتا تو اس نے منٹو کے لیے ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔ بظاہر منٹو اس پر عمل کرتا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک ڈسک تھی

جس میں وہ اپنے مسودے رکھتا تھا۔ اس ڈسک کے نیچے شراب کی بوتل بھی چھپا کر رکھتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی سے اس نے بتایا کہ اسے یہ "فراڈ کرنا پڑ رہا تھا" صفیہ نے جو پیمانہ مقرر کر دیا تھا اس سے اس کی سیری نہیں ہوتی تھی۔ (منٹو کی چند یادیں اور خطوط)۔ منٹو اشوک کمار کے یہاں جاتا تو شراب کا دور بھی چلتا۔ اس وقت اشوک کمار کی بیوی شوبھا اشوک کمار سے کہتی "دیکھو گانگولی مسٹر منٹو کو زیادتی مت دینا۔ مسز منٹو ہم کو بولیں گی" (اشوک کمار)۔ اشوک کو جب پہلی بار منٹو اپنے گھر لایا تو اپنی بیوی سے اس کا تعارف کرا کے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے دادا منی۔ ہاتھ ملاؤ اس سے" اشوک کمار کو منٹو دادا منی کہتا تھا۔ "صفیہ اور اشوک دونوں جھینپ گئے میں نے اشوک کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ہاتھ ملاؤ دادا منی۔ شرماتے کیوں ہو۔ مجبوراً اسے ہاتھ ملانا پڑا" (اشوک کمار)

منٹو کی دو سالیاں کچھ دنوں کے لیے اس کے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ ان دونوں نے بغیر اپنا نام پتہ بتائے نرگس (مشہور فلم ایکٹرس) کو آئے دن فون کرنا شروع کر دیا اور اس پر جتاتی رہیں کہ اس کی ملاقات کی مشتاق ہیں۔ یہاں تک کہ نرگس کو ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ ان کے یہاں آنے کو تیار ہو گئی۔ انہوں نے منٹو کے فلیٹ کا پتہ نرگس کو بتا دیا تھا۔ منٹو کا فلیٹ بائی کلہ میں تھا۔ بائی کلہ پل کے پاس ایک اسٹور سے نرگس نے فون کیا کہ وہ پہونچ گئی ہے لیکن مکان نہیں مل رہا ہے۔" چنانچہ تینوں افراتفری کے عالم میں تیار ہو رہی تھیں کہ میں بلائے ناگہانی کی طرح خلاف معمول دوپہر کے قریب گھر پہونچ گیا۔ چھوٹی دو (سالیاں) کا خیال تھا کہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔ بڑی، یعنی میری بیوی، محض بوکھلائی ہوئی تھی کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ میں نے ناراض ہونے کی کوشش کی لیکن اس کے لیے کوئی جواز نہ ملا" (نرگس)۔ منٹو کا یہ ردِ عمل بیوی کے ساتھ اس کی رواداری کا بین ثبوت ہے۔ نرگس ایک نہایت معروف فلم ایکٹرس تھی۔ اس کی ماں، جدن بائی، جو اس کے ساتھ منٹو کے یہاں آئی تھی خود ایک فلم کمپنی کی مالک تھی۔ بغیر منٹو کے اس کی سالیوں نے منٹو کے چھوٹے سے فلیٹ میں انہیں بلا لیا۔ یہ ساری باتیں منٹو کو ناراض کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اسی طرح بلا منٹو کو مطلع کیے ایک دفعہ تینوں یعنی منٹو کی دونوں سالیاں اور صفیہ، نرگس کی دعوت قبول کر کے اس کے گھر پہونچ گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد صفیہ نے منٹو کو یہ بات بتا دی "میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ تو اس نے سچ سمجھتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ واقعی ہم سے غلطی ہوئی

مگر خدا کے لیے آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجیے گا۔" ایک ایکٹرس کے گھر جانا ان تینوں بہنوں کے لیے بہت معیوب بات تھی۔ وہ اس حرکت کو چھپانا چاہتی تھیں۔" منٹو نے دل میں سو چاکر یہ ان کی تنگ نظری تھی۔ لیکن اس کا اظہار اس نے بیوی کے سامنے نہیں کیا۔ (نرگس)۔ منٹو دوستوں کے یہاں جاتا تو اکثر بیوی کو بھی ساتھ لے جاتا۔ شوکت حسن رضوی نے، جو مشہور فلم ایکٹرس، نورجہاں، کا شوہر تھا، اپنے دوستوں کی دعوت کی۔ منٹو اور اس کی بیوی کو بھی مدعو کیا۔ وہاں نورجہاں بھی تھی۔ فلم کمپنیوں سے منسلک چند دوسرے رند مشرب افراد بھی تھے۔ کھانے کے بعد منٹو بیوی کے ساتھ واپس چلا آیا اور اس کے بعد محفل نشاط جم گئی۔ (نورجہاں)

منٹو جب دلی میں تھا تو لڑکی کی کلالات کے سلسلے میں وہاں ایک پارسی ڈاکٹر کے یہاں دونوں کئی بار جانا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے لڑکے ساوک کاپڑیا اور اس کی بیوی خورشید کے گھرانے سے ان کا کافی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ صفیہ کی خورشید سے دوستی ہو گئی۔ ساوک کاپڑیا کا ایک غیر شادی شدہ سکھ دوست زور آور سنگھ تھا۔ اس کا ساوک کاپڑیا کے یہاں روز کا آنا جانا تھا۔ چنانچہ منٹو کی اس سے بھی ملاقات ہو گئی۔ منٹو جب بمبئی واپس آ گیا تھا تو زور آور سنگھ منٹو کی ملاقات کے لیے جس فلم کمپنی میں منٹو کام کرتا تھا وہاں پہونچا لیکن منٹو سے ملاقات نہ ہوئی۔ زور آور سنگھ ایک پرزہ وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے منٹو اور اس کی بیوی کو دوسرے دن شام میں تاج ہوٹل میں بلایا تھا۔ وہ وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ لوگ وہاں پہونچے تو انہوں نے خورشید کو بھی دیکھا۔ وہ منٹو کی بیوی سے گلے ملی۔ اور جب صفیہ نے زور آور سنگھ سے دریافت کیا کہ اس نے شادی کی یا نہیں تو خورشید نے بتایا کہ دونوں نے شادی کر لی ہے اور بمبئی ہنی مون منانے آئے ہیں۔ یہ سنتے ہی صفیہ نے منٹو کا ہاتھ پکڑ کر کہا "چلیے سعادت صاحب" اور دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ منٹو کہتا ہے "خدا معلوم سردار زور آور سنگھ اور خورشید نے ہماری اس بدتمیزی کے متعلق کیا کہا ہوگا" (خورشٹ) منٹو کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو بے موقعگی کا احساس اسے بیوی کی بات ماننے سے روک دیتا۔

منٹو نے اپنی بیوی کا ذکر اپنی کئی دوسری تخلیقات میں بھی اس انداز سے کیا ہے جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اسے اپنی بیوی سے صرف محبت ہی نہیں تھی۔ اسے اس کی دلجوئی کا خیال تھا اور اس کی خاطر داری کرنے سے چوکتا نہیں تھا۔ وہ اپنی بیوی کے جذبات کا کافی احترام کرتا تھا۔ عام طور پر اس کی باتیں مان لیتا تھا۔ اکثر یہ جانتے ہوئے بھی کہ کسی خاص معاملے میں صفیہ کا خیال درست نہیں ہے، منٹو اس سے بحث میں نہیں پڑتا تھا۔ حالانکہ منٹو بہت نازک

مزاج تھا۔ بحث میں پڑنا اس کی عادت تھی اور وہ ہمیشہ اپنی بات کی پچ رکھنا چاہتا تھا دوسروں کے مقابلے میں اسے اپنی برتری کا بہت زیادہ احساس تھا۔ لیکن بیوی کے معاملے میں اس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ شادی کے قبل منٹو رام کھلاون دھوبی سے کپڑے دھلوایا کرتا تھا۔ منٹو کو اس پر کامل اعتماد تھا۔ رام کھلاون کبھی مزدوری کے لیے تقاضہ نہیں کرتا تھا اور بغیر حساب رکھے جب بھی جتنی رقم منٹو دے دیتا اسے قبول کر لیتا۔ شادی کے بعد منٹو نے صفیہ سے رام کھلاون کی ایمانداری کی تعریف کی تو اس نے کہا کہ باضابطہ حساب کتاب نہ رکھنے میں دھوبی کا فائدہ ہوتا ہوگا۔ اس طرح وہ منٹو سے زیادہ پیسے اینٹھ لیتا ہوگا۔ منٹو نے بیوی کی تردید نہ کی حالانکہ اسے یقین تھا کہ صفیہ کا خیال صحیح نہیں تھا۔ چنانچہ دھوبی کو آزمانے کے لیے ایک مہینے میں جب ڈھائی سو کپڑوں کی دھلائی دھوبی کو ادا کرنی تھی صفیہ نے اسے یہ کہہ کر کہ صرف ساٹھ کپڑے دھلے ہیں اتنی ہی کی اجرت ادا کی۔ رام کھلاون نے اسے قبول کر لیا۔ پھر جب صفیہ نے یہ کہہ کر کہ اس سے مذاق کیا گیا تھا، ڈھائی سو کپڑوں کی دُھلائی دی تو دھوبی نے اسے بھی اسی طرح قبول کر لیا۔ (رام کھلاون)

منٹو صفیہ کے ہمراہ پونا سے پربھات نگر جا رہا تھا۔ جس تانگے پر یہ دونوں پونا میں سوار ہوئے تھے نہایت سُست رفتار تھا۔ منٹو کو بیزاری پیدا ہو رہی تھی، اس نے صفیہ سے پوچھا کہ کیا کیا جائے۔ صفیہ نے کہا کہ تانگہ بدلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسرے تانگے اس سے بہتر نہیں ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو پیدل چلنا ہوگا۔ ”میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا۔“ راستے میں انہیں منٹو کا دوست چڈہ مل گیا۔ چڈہ نے اپنے مکان میں ان کے کچھ دیر آرام کرنے کا انتظام کر دیا۔ اور خود یہ کہہ کر چلا گیا کہ جلد ہی واپس آ جائے گا۔ ”بہت معمولی سا مکان تھا۔ پلستر اندر باہر اکھڑا ہوا تھا۔ مکان کا حال دیکھ کر منٹو کہتا ہے ”مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو میری بیوی ہے ایسے گندے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی۔“ منٹو اپنی بیوی کی نفاست پسندی اور اپنے اور بیوی کے مزاج میں موافقت کا معترف ہے۔ پربھات نگر میں منٹو کا دوست سریش اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ”وہاں کے ماحول میں میری قہر درویش بر جان درویش بیوی دو تین دن گذار سکتی ہے۔“ منٹو کو صفیہ کی عافیت اور دلبستگی کا کافی خیال تھا۔ چڈہ جلد واپس آ گیا اور اس نے صفیہ سے ایک بھونڈا سا مذاق کیا ”میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی تو اب بالکل راکھ ہو گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی۔“ منٹو تھوڑی دیر کے بعد

چڈہ کے ساتھ اسٹوڈیو چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کی بیوی آرام کرسی پر بڑے آرام سے سورہی تھی "، ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا "۔ منٹو اور چڈہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ "جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا "، چڈہ نے چائے منگوائی اور صفیہ کے پاس تپائی پر رکھ دی۔ صفیہ نے بغیر ان لوگوں کو پوچھے جب دو پیالیاں پی لیں تو ان سے سوال کیا " آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہوں گے ؟ " جس کا جواب انہوں نے اثبات میں دیا۔ حقیقت میں دونوں نے مل کر رم کی بوتل خالی کی تھی۔ چڈے نے پھر ویسی ہی بھونڈی بات کی جو صفیہ کو پسند نہ آئی۔ " دراصل اس کو چڈے سے نفرت تھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی۔ اور چڈہ بالخصوص اسے بہت کھلتا تھا۔" چڈہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور تخلیہ ملا تو منٹو نے بیوی کو سمجھایا کہ " کباب ہونے کی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آ ہی جایا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گذر جانے دیا جائے لیکن حسب معمول اس نے میری کنفیوشسانہ نصیحت کو پلے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی "۔ منٹو کا افسانہ ممی کے ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفیہ منٹو کی لا ابالی زندگی پر اعتراضات کرنے سے باز نہیں آتی تھی اور منٹو انھیں خوش دلی کے ساتھ برداشت کر لیا کرتا تھا۔

بربھات نگر میں منٹو صفیہ کو سریتش کے گھر چھوڑ کر چڈہ کے ساتھ سعیدہ کاٹج چلا آیا جہاں چند دوسرے فلم انڈسٹریز میں کام کرنے والے کے ساتھ شراب کا دور چلتا رہا۔ وہاں سے پھر جب سریتش کے یہاں آیا تو منٹو کے ہمراہ چند اور دوسرے دوست بھی تھے۔ " اس کی بیوی نے غیض و غضب کا اظہار نہیں کیا "۔ اس روز رات میں سعیدہ کاٹج میں محفل نشاط جمنے والی تھی۔ منٹو کی بیوی پر اسے ظاہر نہ کرنا تھا۔ چنانچہ سریتش نے صفیہ کے سامنے منٹو سے کہا " چلو یار تم میرے ساتھ چلو "۔ اور دوسرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا " ان کو چھوڑ دو "۔ پھر منٹو سے مخاطب ہو کر کہا " سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہیں گے "۔ منٹو نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر ایک نہایت وفادار شوہر کے انداز میں کہا " ان سے اجازت لے لو "۔ اجازت مل گئی۔ " میری سادی لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی "۔ اور منٹو سریتش کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ منٹو جب سعیدہ کاٹج سے سریتش کے گھر لوٹا تو اس نے بیوی کا مزاج معتدل پایا۔ اور سریتش کی بیوی سے اجازت لے کر میاں بیوی بمبئی لوٹنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں منٹو نے ممی کی باتیں کیں۔ ممی ایک بیوہ

کرسٹان عورت تھی۔ پونا کی فلم انڈسٹریز میں کام کرنے والے نصف درجن افراد سیٹھ کاٹیج میں رہتے تھے۔ ممی کی حیثیت ان کی گارجین کی تھی۔ وہ ان کی رنگ رلیوں کا انتظام کرتی۔ ان کی تفریح کے لیے دوسری عیسائی لڑکیوں کو جمع کرتی۔ سبھوں کے ساتھ وہ مادرانہ شفقت سے پیش آتی۔ اس رات کی پارٹی میں چڈہ نے ایک نہایت کم سن لڑکی، 'پی لس'، کو جسے ممی نے وہاں بلالیا تھا ممی کی غیر موجودگی میں شراب پلا کر از ہوش رفتہ کر دیا تھا۔ خود شراب کے نشے میں مست، ممی کی موجودگی میں پی لس کے ساتھ پیش قدمی کرنا چاہتا تھا۔ اور باوجود ممی کے بار بار روکنے کے وہ اپنی نیت بدلنے کو تیار نہیں تھا۔ ممی نے اس کے منہ پر ایک چانٹا مارا اور اسے ہال سے باہر نکال دیا۔ منٹو نے ساری باتیں من وعن صفیہ سے دہرادیں۔ منٹو اپنی کوئی بات بیوی کے لیے راز نہ رکھتا تھا۔ جس سے میاں بیوی کے غیر معمولی خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ چڈہ کے ساتھ ممی کے سلوک کو سن کر صفیہ کا ردعمل یہ تھا "پی لس اس کی کوئی رشتہ دار ہوگی یا وہ اسے کسی اچھے اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی جس سے اس نے چڈے سے لڑائی کی"، "میں خاموش رہا۔ اس کی تردید کی نہ تائید"۔ منٹو بیوی کی دلداری کے خیال سے اس سے کسی بات میں اختلاف کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ ممی کے کردار سے منٹو بہت متاثر تھا اور اس کے خیال میں صفیہ کا ردعمل نہایت نامناسب تھا لیکن منٹو نے اس کی تردید نہ کی۔ حالانکہ وہی منٹو دوسروں کے نزدیک منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے نہایت بدنام تھا۔ اور بات بات میں دوستوں سے بھی جھگڑ جایا کرتا تھا۔ (ممی)

منٹو بیوی کے غائبانہ میں بھی اس کے خیال سے غافل نہیں رہتا تھا۔ بعد میں پھر ایک بار تنہا پربھات نگر آیا تو سریش کی بیوی سے اپنی بیوی کی باتیں کرتا رہا۔ (ممی) عصمت بھی جب پہلی بار صفیہ کی غیر موجودگی میں منٹو سے ملی تھی تو وہ بار بار صفیہ کا ذکر کرتا رہا تھا۔ (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے مضمون 'منٹو کی چند یادیں اور خطوط' میں منٹو کے جن خطوط کی نقل کی ہے ان میں سے اکثر خطوط میں جو اس نے اپنی شادی کے بعد لکھے ہیں منٹو نے صفیہ کا ذکر کیا ہے۔

منٹو صرف خود ہی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر کاربند نہیں تھا بلکہ دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتا تھا۔ وہ نواب کشمیری کے فن کا قائل تھا۔ نواب ایک نہایت کامیاب فلم ایکٹر تھا۔ اس نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنی پہلی بیوی کی زندگی میں

دوسری شادی کرلی تھی۔ اس کی بیوی نے کراسن تیل چھڑک کر خودکشی کرلی تھی لیکن اپنے دس ہزار کے بیمہ کی رقم کے متعلق وصیت کردی کہ نواب کو مل جائے ساتھ ہی ساتھ ساٹھ تولہ سونا بھی اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ نواب کا تذکرہ کرتے ہوئے منٹو لکھتا ہے "کشمیری میں بھی ہوں لیکن اتنا ظالم نہیں جیسا کہ وہ تھا۔ اس نے صرف اولاد کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو خودکشی پر مجبور کردیا۔ میں ایسے کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیوی کے ساتھ برا سلوک کریں۔" منٹو نواب کے ایک عزیز کے بیان کو نقل کرتا ہے "نواب بڑا طہارت پسند تھا۔ مرحوم کی زندگی بڑی پاک صاف تھی" لیکن چونکہ نواب نے اپنی بیوی کی مرضی کے خلاف دوسری شادی کرلی تھی، منٹو خدا سے دعا کرتا ہے کہ "اسے دوزخ نصیب ہو کہ وہاں وہ زیادہ خوش رہے گا" (نواب کشمیری) منٹو کا نواب کے متعلق یہ شدید منفی تاثر بیوی کے ساتھ اس کے اپنے عدیم المثال حسن سلوک کی غمازی کرتا ہے ورنہ حقیقت میں نواب نے دوسری شادی کرکے کوئی ایسا گناہ نہیں کیا تھا کہ اسے جہنم واصل کیا جاتا۔

منٹو گھر کے کاموں میں بھی بیوی کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ اس نے بیٹے کی دیکھ بھال کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ جس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ عصمت سے منٹو نے کہا تھا "مجھے تو اس نے آیا بنا دیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے پوتڑے دھوتا رہتا۔" (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ منٹو اپنا کام خود کرنے کا عادی تھا۔ مثلاً بیوی کے رہتے ہوئے بھی جوتے پر پالش خود کیا کرتا تھا۔ "اپنے سفید جوتے پر پالش کر رہا تھا کہ میری بیوی نے آکر کہا زیدی صاحب آئے ہیں۔ میں نے جوتے بیوی کے حوالے کیے اور ہاتھ دھو کر دوسرے کمرے میں چلا آیا۔" (مس ٹین والا)

منٹو کی عادات و خصائل

"منٹو کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت تھی۔ گورا چٹا رنگ، پتلے سُرخ لب، چوڑی پیشانی، چھریرا بدن، آنکھوں پر چمک دار عینک، صاف ستھرا لباس وہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے خوب صورت اور نحیف جسم میں کچھ برقی لہریں ہیں۔ حرکات و سکنات میں اضطراب کی کیفیت ہوتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں تمام اعضا حرکت کرتے تھے۔ چہرے پر کچھ رنگ آتے کچھ رنگ جاتے" (شاعر منٹو نمبر)۔

منٹو کے رہن سہن میں سلیقہ اور ستھراپن اور اس کی نفاست پسندی باوجود اس کی کثرت شراب نوشی کے عدیم المثال تھی۔ احمد ندیم قاسمی اس کی صفائی ستھرائی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تاثر کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔ "منٹو کے گھر میں مجھے سلیقہ، صفائی اور سادگی کا وہ معیار نظر آیا جو بڑے بڑے گھروں میں بھی بعض وقت محض ذوقِ لطیف کی کمی کے باعث غائب ہوتا ہے۔ منٹو کے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں چاندنی کا فرش بچھا رہتا۔ کتابیں نہایت سلیقے سے ایک لمبے شلف میں سجی رہتیں اور گورا چٹا منٹو سفید لباس پہنے وہاں بیٹھا لکھتا اور ٹائپ کرتا نظر آتا"۔ ندیم کو منٹو کے مکان کی خوبصورت سادگی کا ذکر کرتے وقت ۱۹۴۸ء کا ایک واقعہ یاد آگیا جب منٹو ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور میں مقیم تھا۔ ندیم کے گھر کی ایک ہفتہ قبل سفیدی ہوئی تھی، منٹو نے اسے دیکھ کر کہا تھا "تم شاعر ہو کے ایسی سفیدی برداشت کئے بیٹھے ہو"۔ پھر جب وہ ندیم کو اپنے گھر لے گیا تو اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بولا "سفیدی اس کو کہتے ہیں"۔ (منٹو سے چند ملاقاتیں اور خطوط)۔ منٹو کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ کے تحت ادارہ شاعر اس کی نفاست پسندی کی ایک مثال پیش کرتا ہے "اس کے سلیقہ

اور صفائی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی دوست سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں ڈالنے کے بجائے فرش پر جھاڑ دیتا تو وہ بے تکلف ہو کر اس کے ہاتھ میں جھاڑو پکڑا دیا کرتا تھا اور اس سے فرش صاف کرنے کو کہتا" (شاعر منٹو)۔ اپنے طویل افسانے ممی میں منٹو اپنی بیوی کی نفاست پسندی اور گندگی سے بیزاری کا ذکر کرتے ہوئے اپنے صفائی اور ستھرائی کے ذوق کا بھی اظہار کرتا ہے۔ چڈہ کے مکان کی زبوں حالی پر اپنی بیوی کا تاثر بیان کرتے ہوئے منٹو کا یہ کہنا کہ وہ عورت جو اس کی بیوی ہے" ایسے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی" اس کی بیوی سے زیادہ خود اس کی نفاست پسندی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ (ممی)

منٹو کو شراب نوشی کی لت تھی جس کا ذکر کرنے میں اسے کوئی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ گنجے فرشتے اور لاؤڈ سپیکر کے تقریباً ہر خاکے میں یا ان افسانوں میں جن میں وہ خود کو بھی کسی نہ کسی حیثیت سے پیش کرتا ہے، وہ غیر ضروری اور اکثر بے موقع طور پر اپنی کثرت شراب نوشی کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے رند بلا نوش ہونے کا ڈنکا پیٹنا چاہتا تھا۔ لیکن باوجود کثرت شراب نوشی کے منٹو کبھی ہوش سے گذرتا نہیں تھا۔ خود کہتا ہے "میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لیے میرے جذبات معتدل تھے" (ممی)۔ عصمت چغتائی منٹو کی شراب نوشی کی عادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں" یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ اور زبان میں لکنت نہ پائی۔ مجھے تو کبھی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوا کہ جب زیادہ پیے ہو تو یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشے میں نہیں ہے۔" (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ منٹو شراب پی کر بے قابو ہونے کا اسی حد تک اقرار کرتا ہے کہ "جب میں پیئے ہوئے ہوتا ہوں تو مجھے تکلف برتنا نہیں آتا۔" (پر اسرار نینا)۔ یعنی وہ کچھ زیادہ صاف گو اور منہ پھٹ ہو جاتا ہے۔

شراب اس کے منہ سے ایسی لگی تھی کہ پاگل خانے میں شراب چھڑانے کے لیے رکھے جانے کے باوجود بستر مرگ پر بھی شراب نے منٹو کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ جانتا تھا کہ شراب کی وجہ سے اس کے جسم کو گھن لگ رہا تھا، اس کا جگر چھلنی ہو گیا تھا لیکن اگر کوئی اسے شراب چھوڑنے کو کہتا تو اس سے ناراض ہو جایا کرتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی

سے وہ محبت کرتا تھا۔ ندیم کے نام منٹو کے خطوط اس کی گواہی دیتے ہیں۔ لیکن ندیم سے بھی اس کی اسی بات کے لیے ان بن ہو گئی کہ ندیم نے اسے شراب پینے سے روکا تھا۔ اس موقع پر منٹو نے نہایت سخت جملے کا استعمال کیا تھا۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور تم میرے دوست ضرور ہو مگر میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا ہے" (منٹو سے چند ملاقاتیں اور خطوط)۔

منٹو کا طریقہ نشست کچھ عجیب تھا۔ بقول عصمت چغتائی "منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا" (منٹو میرا دوست میرا دشمن) عصمت کی جب منٹو سے پہلی ملاقات ہوئی تو عصمت نے دیکھا کہ "ایک مکوڑے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔" "ایک بار مجھ سے بحث کرتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا"۔ اوپندر ناتھ اشک نے منٹو کے طریقہ نشست کی زیادہ واضح تصویر پیش کی ہے۔ "پاؤں اوپر کیے، گھٹنوں کو باہوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ (منٹو — میرا دشمن) منٹو نے اپنے خود نوشت خاکے میں اپنی نشست کے انداز کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا انڈے دیئے جاتا ہے جو بعد میں چوں چوں کر کے افسانے بن جاتے ہیں۔"

منٹو غیر معمولی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کا مالک تھا۔ جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا تو اس کے ذمے ریڈیائی ڈرامے لکھنے کا کام سپرد تھا۔ کرشن چندر

ان دنوں ڈرامے کا انچارج تھا۔ "منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اردو کا ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا کہ کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے۔ موضوع سنتے ہی وہ فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا۔ اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا۔" (منٹو میرا دشمن)۔ جن دنوں منٹو سخت مالی مشکلات کا شکار تھا اپنے روز کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے دو تین افسانے لکھنے پڑتے۔ "اس کا خرچ تقریباً تیس روپے یومیہ تھا۔ وہ ایک نشست میں طویل سے طویل افسانہ ختم کر دیتا تھا۔ اپنے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں ایک بار کرتے اور بڑے پائنچوں کے پاجامہ میں ملبوس آرام کرسی پر ٹانگیں سکیڑے وہ اس تیزی سے لکھتا تھا کہ گویا اسے کہانی حفظ ہے اور وہ اسے کاغذ پر نقل کر رہا ہے۔ کہانی شروع کرنے سے پہلے چند ساعت وہ بے چین ضرور نظر آتا تھا۔ وہ بار بار قلم کو منہ میں دباتا۔ پھر کاغذ پر بسم اللہ کے اعداد ۷۸۶، لکھتا اور اس کا قلم دوڑنے لگتا۔" (شاعر منٹو نمبر)۔ "۷۸۶ لکھ کر جو پہلا فقرہ اس کے

ذہن میں آئے گا اس سے افسانے کا آغاز کر دے گا۔" (خود نوشت خاکہ) ۔ جن دنوں وہ فلمستان میں ملازم تھا، ایس مکرجی نے اس سے کہا "تم کہانی کیوں نہیں لکھتے ہو؟" ان دنوں وہ مکالمہ نویسی کا کام کر رہا تھا۔ منٹو نے پانچ دن میں چار کہانیاں لکھ دیں۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب کہانی لکھنے میں اس نے وہ مشاقی پیدا نہیں کی تھی جو بعد میں اسے حاصل ہوئی۔

باوجود اپنی بلانوشی کے جس کا اشتہار پیٹے بغیر منٹو کو چین نہیں آتا تھا اور باوجود اس گناہ پرور اور اخلاق سوز ماحول کے جس میں منٹو نے اپنی زندگی کے سالہا سال بسر کیے اس کی خدا ترسی اور مذہب کا احترام ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ بقول خود "جب کبھی کوئی مضمون لکھا پہلے صفحے کی پیشانی پر ۷۸۶ ضرور لکھا۔ جس کا مطلب ہے بسم اللہ۔ اور یہ شخص جو خدا کا منکر نظر آتا ہے کاغذ پر مومن بن جاتا ہے" (خود نوشت خاکہ)۔ ایک دفعہ منٹو نے جنجر کے گلاس میں باری علیگ کی لاعلمی میں رم ملا کر انہیں پلا دیا جس سے ان کی طبیعت میں جو اس سے پہلے مضمحل ہو رہی تھی بشاشت پیدا ہو گئی۔ ادرک کے طبی فائدوں کے مد نظر باری صاحب نے سمجھا کہ یہ اسی کا کرشمہ تھا۔ اور جب منٹو نے ان پر یہ راز افشا کر دیا کہ یہ رم کی برکت تھی تو انہیں بہت تکلیف ہوئی۔ "وہ میری طفلانہ حرکت انہوں نے معاف تو کر دی مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ انہیں سخت روحانی کوفت

ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے صدق دل سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ کبھی شراب نہیں پیوں گا۔" (باری صاحب) منٹو جب اپنے گھر لوٹنے لگا تو اس نے گلی کے فرش پر سجدہ کیا اور "خدا سے دعا مانگی کہ وہ مجھے اپنے ارادے میں ثابت قدم رہنے کی توفیق دے اور اس گناہ کو جو مجھ سے سرزد ہوا ہے معاف کر دے" (باری صاحب)۔ ایک روز ہولی کے تہوار کے موقع پر، منٹو اشوک کمار کے ساتھ فلم ایکٹرس، پارو دیوی، کے یہاں گیا۔ وہاں پہلے تو شراب کا دور چلا۔ اس کے بعد پارو دیوی سے گانے کی فرمائش کی گئی۔ ٹھمریاں، غزلیں، گیت دیر تک ہوتے رہے۔ آخر میں پارو نے بھجن سنایا اور جب اسے منٹو کی موجودگی کا احساس ہوا تو بھجن کے بعد نعت شروع کر دی۔ منٹو نے اسے یہ کہہ کر روک دیا "پارو دیوی یہ محفل نشاط ہے۔ شراب کے دور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے" (پارو دیوی)۔ مذہبی بزرگوں کے خلاف منٹو نے کبھی قلم نہیں اٹھایا۔ منٹو اپنے ایک مضمون "ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ" (منٹو کے ادبی مضامین) میں لکھتا

ہے " ہمارے ملک کو صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمر کا سا اخلاص رکھتا ہو"
اس کے بچپن کے دوست سعید قریشی نے اس کا افسانہ ' صاحب کرامات ' کا ذکر کرتے ہوئے
اسے " ایک بزرگ کی داستان ' کہا ہے ۔ حالانکہ منٹو نے اس افسانے میں ایک لفنگے کی
کرتوت بیان کی ہے جس نے نقلی داڑھی لگا کر اور ایک بزرگ کا بھیس بنا کر ایک سادہ
لوح کسان کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دھوکہ دے کر حرام کاری کی تھی ۔ مذہب کی لافانی
حقانیت پر منٹو کا ایمان ہے " مذہب کی روح ایک ٹھوس حقیقت ہے جو کبھی تبدیل
نہیں ہو سکتی " منٹو کا یہ جملہ کہ " مذہب ایک ایسی چٹان ہے جس پر سمندر کی خشمناک
لہریں بھی اثر نہیں کر سکتیں " مذہب سے اس کی گہری عقیدت کی ترجمانی کرتا ہے ۔ البتہ
منٹو سیاسی لیڈروں کا سخت [illegible] کی تھا اور ان کا پول کھولنے میں اسے کبھی احتراز نہیں
ہوتا تھا " یہ لیڈر جب آنسو بہا کر کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے تو اس کی کوئی حقیقت
نہیں ہوتی ۔ مذہب ایسی چیز نہیں جو خطرے میں پڑ سکے ۔ اگر کسی بات کا خطرہ ہے تو ان
لیڈروں کا جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے مذہب کو خطرے میں ڈالتے ہیں " (منٹو کے
ادبی مضامین) لیڈروں پر بے اعتمادی اور ان سے بد دلی کی وجہ سے منٹو نے گنجے فرشتے
میں مسٹر جناح تعریف اپنے منہ سے کرنے کے بجائے ان کے ڈرائیور کی زبان سے کرائی
ہے ۔ (میرا صاحب) گنجے فرشتے کے سارے خاکوں میں یہی ایک خاکہ ہے جس میں منٹو خود
نہیں بول رہا ہے ۔

باوجود مالی مشکلات کے جس نے منٹو کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑا ، منٹو اپنی مٹھی بند
نہیں کر سکتا تھا ۔ ۱۰ ارمئی ۱۹۳۷ء کو منٹو ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں لکھتا ہے " میں
بمبئی میں پچاس روپے ماہانہ کما رہا ہوں اور بے حد فضول خرچ ہوں ۔ ابھی آٹھ روز ہوئے
میرے پاس پانچ سو روپے تھے اور اب یہ حالت ہے کہ صرف پچاس روپے باقی ہیں مجھے
کتابیں خریدنے اور یونہی روپیہ برباد کرنے کا خبط ہے ۔ اور میں اس سے لطف اٹھاتا
ہوں " ۱۹۳۸ء میں منٹو مجردانہ زندگی گذار رہا تھا ۔ اور اس وقت پچاس روپے کی
قیمت بہت زیادہ تھی ۔ ۱۹۳۸ء تک کا وہ زمانہ تھا جب ایک آدمی کو دس روپے
ماہوار میں کسی اچھے ہوٹل میں اچھے سے اچھا کھانا اور ناشتہ میسر ہو سکتا تھا ۔ منٹو جب آل
انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا تو اس نے احمد ندیم قاسمی کو دلی بلایا ۔ " ایک طویل اوپر
اور چند منظوم مکالموں کی اجرت کے معاملے میں ریڈیو کے حکام سے خوب خوب لڑائیاں

کیں۔ پھر جب مجھے خاصی رقم دلوا چکا تو مجھے چاندنی چوک لے گیا۔ وہاں اس نے امرتسری دکان سے میرے لیے پتلون اور کوٹ کے کپڑے خریدے" (منٹو کی چند یادیں اور خطوط)۔ بمبئی میں جب میراجی سے ملاقات ہوئی تو اس نے شراب کا ایک ادھا خریدنے کے لیے منٹو سے سات روپے طلب کیے "وہ اس کے بعد سے بہت دیر تک اس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرض ہوگیا۔ میں خود بوتل کا رسیا تھا۔ یہ سن لگے تو جی پر کیا گذرتی ہے اس کا مجھے بخوبی علم تھا اس لیے میں اس رقم کا انتظام رکھتا۔ سات روپے میں رم کا ادھا آتا تھا۔ باقی آٹھ آنے اس کے آنے جانے کے ہوتے تھے" (تین گولے)۔ منٹو جب دلی ریڈیو اسٹیشن سے علحدہ ہوکر بمبئی واپس آیا تو اس وقت اس کی شادی ہوچکی تھی، اس کا دھوبی، رام کھلاون، دیسی شراب پی کر تشویشناک مرض کا شکار ہوگیا تھا۔ صفیہ اسے ٹیکسی پر بٹھا کر اس کے گھر سے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس کے علاج معالجہ کا سارا خرچ منٹو نے برداشت کیا (رام کھلاون)۔

منٹو جہاں دوسروں کے ساتھ احسان کرنے میں دریغ نہیں کرتا تھا اسی طرح اگر کوئی اس کے ساتھ سلوک کرتا تو وہ اس کا ذکر کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ باری علیگ

کے جو اس پر احسانات تھے، ان کا جس خلوص اور خوش دلی سے منٹو نے اظہار کیا ہے اسکا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ چراغ علی حسرت سے اس کی نوک جھونک برابر ہوتی رہتی۔ لیکن جب ٹھنڈا گوشت کے مقدمے میں منٹو پر تین سو روپے کا جرمانہ ہوگیا تو "حسرت صاحب نے کمال شفقت سے مجھے ایک رقعہ لکھا جس میں یہ جذبہ مرقوم تھا کہ مجھے آپ کی سزا پر بہت افسوس ہے۔ اگر میں آپ کی خدمت کرسکوں تو حاضر ہوں" (چراغ علی حسرت)۔ فلم نوکر کے پلاٹ اور مکالمے کے سلسلے میں شوکت حسین رضوی سے اس کی ان بن ہوگئی تھی اور بمبئی میں شوکت سے منٹو کی آمد و رفت بند ہوگئی تھی لیکن جب دونوں پاکستان چلے گئے تو پھر ان کے دوستی ہوگئی اور منٹو نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ منٹو کی اکثر مدد کرتا رہتا تھا۔ (نور جہاں)۔ شیام کے جو احسانات منٹو پر تھے اور جس فراخدلی سے شیام نے کی روپیوں سے مدد کی تھی اس کا تفصیلی ذکر منٹو نے اپنے خاکے مرلی کی دھن میں کیا ہے۔ اسی خاکے میں منٹو مکتبہ جدید لاہور کے چودھری برادران کے احسانات کا بھی ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے " مالی حالت بہت کمزور تھی۔ آس پاس کے ماحول نے جب تنگ کر دیا تو آمدنی کے ذرائع سکڑ گئے۔ ایک عرصے تک

مکتبہ جدید کے چودھری برادران تھے جو مقدور بھر میری مدد کر رہے تھے۔ غم غلط کرنے کے لیے جب میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کر دی تو انہوں نے چاہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ مگر ایسے مخلص تھے کہ مجھے ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔" (مرلی کی دھن) اس طرح جس کسی نے منٹو کے ساتھ حسن سلوک کیا تھا، منٹو نے اپنے خاکوں میں اس کا ذکر کیا ہے جس سے اس کے احسان شناسی کے جذبے کی تصدیق ہوتی ہے۔

منٹو کا مزاج اور افتاد طبع

منٹو کی وفات کے بعد جن مدیروں نے اپنے خاص نمبر شائع کیے اُن میں منٹو کے فن اور شخصیت پر کافی مضامین شامل ہوئے ۔ ان کے بعض لکھنے والے منٹو کی زندگی میں اس سے بہت زیادہ قریب رہے تھے۔ منٹو کی مزاج شناسی کے معاملے اُن پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بقول خود منٹو اپنے آپ کو کسی سے چھپا نہیں سکتا تھا۔ "میرے دل کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور نہ میں کسی بات کو چھپانا چاہتا ہوں" (منٹو سے چند ملاقاتیں اور خطوط) منٹو نے خود اپنی نگارشات میں اپنے مزاج کی نبض شناسی کا کافی ثبوت دیا ہے۔ منٹو کو اپنی عزتِ نفس کا غیر معمولی احساس تھا۔ وہ اپنی اہانت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت جلد خود احساس ہو جایا کرتا تھا معمولی واقعات سے بھی اس کی عزت میں بٹہ لگ جایا کرتا تھا۔ عصمت چغتائی کہتی ہیں، مجھے تو اپنی شکست چھپانے کا ملکہ ہے۔ منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا ہے آنکھیں مور کے پنکھوں کی طرح تن کر پھیل جائیں، نتھنے پھڑکنے لگتے۔ منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاہد کو پکارتا۔ جنگ ادب یا فلسفے سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو بھنا کر چلا جاتا" (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ اوپندر ناتھ اشک کے مطابق "لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اس کی حرکتوں کو اُس پر آزمایا کرتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جایا کرتا تھا" (منٹو میرا دشمن)۔ منٹو مذاق کرتا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اس میں مفقود تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا۔ لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے تھے ۔ دوسروں کو بھی بات چُبھ سکتی ہے۔ اسے وہ اُونچے درجے کا افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود نہیں جانتا تھا۔" دوسروں کا مذاق اُڑانے پر جب اس کے ساتھ مذاق کیا جاتا، تو منٹو کے چراغ پا ہو جاتے کا ایک واقعہ اشک نے نقل کیا ہے۔ اپنے ایک افسانے 'ترقی پسند' میں منٹو نے "بیدی اور ستیارتھی کی

عادات واطوار، شکل وشباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اُڑایا تھا۔" اس کا انتقام لینے کے لیے
ان دونوں نے نئے دیوتا کے عنوان سے ایک کہانی شائع کرائی جس میں "منٹو کی حرکات و
سکنات، عادات و اطوار، سفلے پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت، سنک فحش نگاری اور
دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اُڑایا تھا کہ منٹو تلملا گیا۔" دونوں کہانیوں
میں فرضی نام استعمال کیے گئے تھے۔ اس کہانی میں سعادت حسن کو بدل کر نفاست حسن کر
دیا گیا تھا۔ ایک دن منٹو اپنے کمرے میں اپنے پرستاروں کے درمیان آل انڈیا ریڈیو کے
دفتر میں بیٹھا تھا کہ کسی نے اسے چڑانے کے لیے "ستیارتھی" اور "نئے دیوتا" کا ذکر چھیڑ دیا۔
"کسی نے کہا ستیارتھی نے نہیں بیدی نے لکھا ہے۔ کسی نے کہا اس میں فیض کا بھی ہاتھ ہے۔
سب کی آواز کو منٹو نے اپنی کرختگی میں دباتے ہوئے کہا... بیدی فیض کیا۔ اس میں تاثیر کا
ہاتھ ہے تبسم کا ہاتھ ہے۔ سنت سنگھ اور موہن سنگھ کا ہاتھ ہے۔ منٹو از این انسٹی ٹیوشن
اپنے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس ہونے یا اپنی شکست سے پریشان ہونے کا منٹو
نے خود بھی اقبال کیا ہے۔ منٹو نے ہمایوں اور عالمگیر کے روسی ادب نمبر مرتب کیے تھے۔
چراغ علی حسرت نے زمیندار یا احسان کے فکاہی کالم میں اس کا ذکر کرتے ہوئے منٹو پر طنز
کیا تھا۔ اسے پڑھ کر منٹو نے "لطف بھی اُٹھایا اور کباب بھی ہوا۔" اسی طرح منٹو نے حسرت
کی قابلیت کا مذاق اڑاتے ہوئے ان پر ایک جملہ چست کیا تھا کہ اُن کی حیثیت محض ایک
"لغت کی ہے جس کے اوراق اُلٹ کر آدمی کسی لفظ کے معنی دیکھتا ہے اور پھر اسے طاق پر
رکھ دیتا ہے۔" حسرت نے اپنے مزاحیہ کالم میں پھر منٹو پر ہاتھ صاف کیا۔ منٹو کہتا ہے "اسے
پڑھ کر بھی میں بہت کباب ہوا تھا۔" اور دیوان سنگھ مفتون کے قول کو دہراتا ہے کہ "اگر میں
کسی کے خلاف کچھ لکھوں اور وہ اسے پڑھ کر رات کو آرام اور اطمینان سے سو جائے تو اس
کا مطلب یہ ہے کہ مجھے بہت بڑی شکست ہوئی ہے۔" اس اعتبار سے حسرت کو منٹو کے
معاملے میں کبھی شکست نہیں ہوئی اس لیے کہ "اُن کی تحریروں نے جو میرے متعلق ہیں ہمیشہ مجھ پر
راتوں کی نیند حرام کی ہے۔" (چراغ علی حسرت)

منٹو گہرے احساسِ برتری کا شکار تھا۔ بقول عصمت "منٹو کی خود داری رعونت
کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا اور اگر
ان دوستوں کے سامنے جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو کوئی اس کا مذاق بنا دے تو وہ بری طرح چڑ

جایا کرتا تھا۔ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کو اپنی سطح سے نیچے سمجھتا تھا۔ لیکن وہ خود کو کسی سے نیچے دیکھا جانا گوارہ نہیں کرتا تھا۔ (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ "پارٹی ہو میٹنگ ہو منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کرے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا" (منٹو میرا دشمن)۔ اس سلسلے میں اشک نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ فلمستان کے مالک 'رائے بہادر چنی لال' نے اسٹوڈیو کی کینٹین میں ایک انگریز ایکٹر کو مدعو کیا تھا۔ ایک بڑی میز کمپنی کے "بوسز" کے لیے مخصوص تھی۔ منٹو حسب معمول اسی پر بیٹھ گیا۔ دوسرے لوگ چھوٹی میزوں پر بیٹھے تھے۔ رائے بہادر چنی لال اور ایس مکرجی کافی دیر کے بعد اس انگریز اور اس کی بیوی کو ساتھ لے کر آئے۔ اس انگریز کے ساتھ آنے والے کئی دوسرے لوگ بھی تھے۔ ان کے علاوہ رائے بہادر چنی لال کے ساتھ بھی کچھ مہمان تھے۔ اشوک اور گیان مکرجی مالکوں میں سے تھے۔ مکرجی نے واچا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ واچا اُٹھ کر چھوٹی میز پر جا بیٹھا۔ اس نے منٹو کو کو پاس بٹھانا چاہا لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔" اس افراتفری میں جب مہمان بیٹھ رہے تھے منٹو چپ چاپ کھسک گیا" (منٹو میرا دشمن)۔ منٹو کی اس کمزوری کا ذکر شاعر کے منٹو نمبر میں اس کی زندگی کے اجمالی خاکے میں بھی ہے۔ "وہ اُٹھتے بیٹھتے' لکھتے پڑھتے' کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ جس پر لوگ چونک پڑیں۔ ایک معمولی سی بات ہے کہ وہ ہمیشہ ٹانگے میں کوچوان کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا کوئی محبوب سے محبوب دوست بھی اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کبھی ایسا ہو جائے تو وہ دوسرا ٹانگہ لے لیتا۔ اور کوچوان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر اس سے کہتا "ٹانگہ میرے یار کے اس ٹانگے سے دوڑالو"۔ حسرت پر اپنے خاکے میں حسرت کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے منٹو خودستائی سے باز نہیں آتا۔ "میں خود کو بھی کسی حد تک قابل سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ابھی تک زندہ ہوں"۔ یعنی اپنی برتری کا احساس اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف منٹو کو اچھی لگتی تھی۔ اس سے اس کے اپنی برتری کے احساس کی تسکین ہوتی تھی۔ اس نے احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں لکھا تھا" آپ کے تعریفی الفاظ سے میں ذرا اُدھ، ہو گیا۔ میں لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ میں اپنی تعریف سے خوش نہیں ہوتا لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے افسانوں کی تعریف کی تو واللہ میں مخمور سا ہو گیا۔ مگر کسی سے کہیے گا نہیں کہ مجھ میں یہ کمزوری ہے"

(منٹو سے چند ملاقاتیں اور خطوط)۔ اشوک کمار کو جب معلوم ہوا کہ وہ منٹو سے دو ماہ کچھ دن بڑا تھا تو وہ اسے بجائے مسٹر منٹو کہنے کے صرف منٹو کہنے لگا۔ اور منٹو بجائے اس کا نام لینے کے دادامنی کہنے لگا۔ اس تبدیلی پر منٹو نے اپنے ردِّعمل کا اظہار اس طرح کیا ہے "حالانکہ یہ مجھے ناپسند تھا۔" اس سے منٹو کی ذکی الحسی اور احساسِ برتری کی غمازی ہوتی ہے۔ منٹو جب بمبئی پہونچ کر ابتدا میں بقول خود "جھک مارتا تھا" اور صرف چالیس روپے پر مصور کو ایڈٹ کر رہا تھا" فلم کمپنیوں میں ملازمت حاصل کرنے کے لیے در بدر مارے پھرنا اس وقت بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا" (بابوراؤ پٹیل)۔

دوسروں کے ہاتھ اپنی عزتِ نفس کی ٹھیس منٹو کی برداشت سے باہر ہو جاتی تھی۔ ایک سال کی باقی تنخواہ کی وصولی کے تقاضے پر نانو بھائی ڈیسائی نے منٹو کو کمپنی سے باہر نکال دیا تھا تو منٹو کے وقار کو سخت دھچکہ لگا تھا۔ رفیق غزنوی سے جب اس کی پہلے پہل ملاقات ہوئی تھی تو رفیق غزنوی کے انداز سے منٹو کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے رفیق جس سے مخاطب ہے بڑے ادنےٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔" یہ احساس ظاہر ہے کہ میرے لیے خوشگوار نہیں تھا" (رفیق غزنوی)۔ ایک بار منٹو کی رفیق غزنوی سے اسٹوڈیو میں ملاقات ہوئی تو منٹو نے رفیق کے ہاتھ میں کریون اے سگریٹ کا ڈبہ دیکھا۔ "یہ میرے مرغوب سگریٹ ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈبہ پکڑنا چاہا۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر ایک طرف کر لیا۔ اور سگریٹ کا ڈبہ اپنی جیب میں ڈال کر کہا: تمھاری عادت بگڑ جائے گی۔ تم اپنا گولڈ فلیک پیا کرو"۔ منٹو کو اپنی سبکی کا شدید احساس ہوا "میرے جاننے والے تین چار آدمی پاس کھڑے تھے۔ میں پانی پانی ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ کھسیانا ہو کر اپنی ٹانگ نوچنا شروع کر دی" (رفیق غزنوی)۔ ایک بار منٹو شیام کے ساتھ پران کے گھر پہونچا۔ پران ایک معروف فلم ایکٹر تھا۔ وہ مشہور فلم ایکٹرس کلدیپ کور سے عشق لڑا رہا تھا۔ کلدیپ کور بھی اس وقت پران کے گھر میں موجود تھی۔ چاروں فل کے فلیش کھیلنے لگے۔ منٹو پچھتر روپے ہار گیا۔ پران پتے بانٹتا تھا اور بڑی چابک دستی سے "ہر بار بڑے داؤ جیتنے والے پتے اپنے پاس گراتا تھا"۔ یہ راز پران نے منٹو پر ظاہر کر دیا اور کلدیپ کور سے کہا کہ وہ منٹو کے روپے واپس کر دے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد پران کہیں چلا گیا۔ اور باقی تینوں ٹیکسی پر سیر کے لیے روانہ ہو گئے۔ کلدیپ کور نے ایک اسٹور کے پاس ٹیکسی رکوائی اور منٹو کو ساتھ لے کر اسٹور میں چلی گئی۔ وہاں اس نے ایک بیس روپے آٹھ آنے کا

سنٹ پسند کیا اور پرس میں رکھ کر منٹو سے کہا" منٹو صاحب قیمت ادا کر دیجئے۔" منٹو قیمت ادا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن" دکان دار میرا واقف تھا۔ اور پھر ایک عورت نے اس انداز سے مجھ سے قیمت ادا کرنے کو کہا تھا کہ انکار کرنا مردانہ وقار کی تذلیل کا باعث ہوتا۔ چنانچہ میں نے جیب سے پیسے نکالے اور ادا کر دیے" (کے کے) منٹو کا بمبئی ٹاکیز سے علاحدہ ہو کر فلمستان میں چلا جانا اور اسے چھوڑ کر پھر بمبئی ٹاکیز کی ملازمت کر لینا اور آخر میں وہاں سے بھی الگ ہو کر ہندوستان سے ہجرت کر لینا' ان سارے اقدام کے پیچھے اسے اپنی ناقدری کا احساس تھا۔ اشوک کمار کو منٹو کی کہانی پسند نہ ہوئی۔ اسے اس کی امید نہیں تھی۔ اس نے بڑی ذلت محسوس کی" وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا۔ بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا" (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ آل انڈیا ریڈیو سے منٹو کی علاحدگی بھی اسی باعث تھی۔" آل انڈیا ریڈیو کی اس میٹنگ میں جہاں راشد نے' میں نے' اور اس لکھنوی پی' اے نے اس کے ڈرامے کی تنقید کی اور بمبئی کے اسٹوڈیو میں جہاں اشوک اور واچا' اس کے جگری دوستوں نے' اس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیاں لے لیں' منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہونچی اور جب اس کی انا کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اس کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا" (منٹو میرا دشمن)

انور کمال پاشا جس نے کئی فلمیں بنائی تھیں' اپنی ایک کہانی کے سلسلے میں منٹو سے مشورہ لینے آیا۔ منٹو نے اس کی کہانی سننی شروع کر دی اور ختم ہونے سے پہلے پاشا کی الجھن منٹو کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے پاشا کی مشکل کا حل بتا دیا۔ پاشا نے کچھ اس انداز سے کہا" کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے" کہ منٹو چڑ گیا۔ اور بولا" حضرت اس سے بہتر حل آپ کو کوئی اور پیش نہیں کر سکتا۔ مصیبت یہ ہے کہ میں فوری طور پر سوچنے کا عادی ہوں۔ اگر میں نے یہی حل آپ کو دس یا بارہ روز کے بعد پیش کیا ہوتا تو آپ نے کہا ہوتا سبحان اللہ۔ مگر اب کہ میں نے چند منٹوں میں آپ کی مشکل آسان کر دی ہے تو آپ کہتے ہیں ہاں ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو شاید اس مشورے کی قیمت معلوم نہیں" پاشا نے پانچ سو روپے کا چک لکھ کر منٹو کو پیش کیا۔ منٹو نے پاشا کے اصرار پر چک تو لے لیا لیکن اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔" یہ میری زیادتی تھی۔ اگر میں آسودہ حال ہوتا یقینی یہ چک پھاڑ دیتا۔ لیکن انسان بھی کتنا ذلیل ہے یا اس کے حالات زندگی کتنے افسوسناک ہیں کہ وہ گراوٹ پر مجبور ہو جاتا ہے"

(انور کمال پاشا) اس واقعہ پر منٹو کا تاثر اس کے عزت نفس کے شدید احساس کی گواہی دیتا ہے۔

منٹو کی ذہنی کشمکش اور داخلی انتشار

منٹو نے اپنے بعض خاکوں میں اپنے اندرونی اضطراب اور ذہنی کشاکش کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ زندگی کے ابتدائی دور میں اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار منٹو ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے آوارہ گردی شروع کر دی تھی۔ طبیعت ہر وقت اُچاٹ اُچاٹ سی رہتی تھی۔ ایک عجب قسم کی کھدبد ہر وقت دل و دماغ میں ہوتی رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ جو چیز سامنے آئے اُسے چکھوں خواہ انتہا درجے کی کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔ تکیموں میں جاتا تھا۔ قبرستانوں میں گھومتا تھا۔ اسکولوں میں جاتی ہوئی لڑکیوں کی جھرمٹ دیکھتا تھا اور اُن میں کوئی اچھی سی لڑکی منتخب کر کے اس سے عشق لڑانے کے منصوبے تیار کرتا تھا۔ میں نے اس زمانے میں شعر کہنے کی بھی کوشش کی۔ فرضی معشوقوں کے نام عطر لگے کاغذوں پر بڑے بڑے طویل محبت نامے بھی لکھے۔ مگر بکواس سمجھ کر پھاڑ دیے۔ دوستوں کے ساتھ مل کر چرس کے سگریٹ پیے۔ کوکین کھائی۔ شراب پی۔ مگر جی کی بے کسی دور نہیں ہوئی" (رفیق غزنوی) اپنے ذہنی انتشار کی کیفیت منٹو ایک دوسرے خاکے میں اس طرح بیان کرتا ہے "ان دنوں میری آوارہ گردی معراج پر تھی۔ بے مقصد سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ دماغ بے حد منتشر تھا۔ اس وقت تو میں نے محسوس نہیں کیا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دماغی انتشار میرے لیے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے بیتاب تھا" (اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں)۔ ججے کے ہوٹل شیراز میں ہر روز گپ بازی کی محفل جمتی تھی۔ عاشق فوٹو گراس محفل میں اختر شیرانی کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" اکثر سنایا کرتا۔ منٹو اس محفل کا ایک مستقل رکن بن گیا تھا۔ اس نظم کو سن کر جو کیفیت منٹو پر طاری ہوتی تھی اسے منٹو اس طرح بیان کرتا ہے۔ "عجیب و غریب کیفیت تھی۔ ججے کے ہوٹل میں بہت اندر اندھیری کوٹھری میں بیٹھا میں یوں محسوس

کرتا کشتی میں بیٹھا ہوں۔ پریاں اسے کھینچ رہی ہیں۔ نازک نازک پروں والی پریاں۔ رات کا وقت ہے اس لیے مجھے ان پریوں کا صرف سایہ سا نظر آتا ہے۔ سمندر پرسکون ہے۔ کشتی ہلکورے کھائے بغیر چل رہی ہے۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف۔ پاپوں کی بستی پیچھے رہ گئی ہے۔ ہم دنیاوی شور و غل سے ہزاروں میل آگے بڑھ گئے ہیں"(اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں)۔

ذہنی پراگندگی نے منٹو کے اندر ماحول سے بیزاری پیدا کر دی تھی۔ وہ اس پراگندگی کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کا ذہنی تکدر شاید اپنے پیچھے کسی ایسے گناہ کے احساس کو چھپائے ہوئے تھا جس سے فرار کے لیے وہ ایسی خیالی دنیا بسا لیا کرتا تھا جہاں کسی پاپ کا گزر نہ ہو سکتا ہو۔

منٹو کا ذہنی اضطراب اور نامتمامی، ناتکمیلی کا احساس اس کے ان خطوط سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو اس نے احمد ندیم قاسمی کو وقتاً فوقتاً لکھا ہے۔ (منٹو سے چند ملاقاتیں اور خطوط) ان خطوں کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ منٹو ندیم قاسمی سے غائت خلوص برتنے لگا تھا اور اپنے دل کا حال ندیم سے بیان کرنے میں منٹو کو تسکین حاصل ہوتی تھی۔ وہ کبھی ندیم کو برادر مکرم، کبھی برادر عزیز، کبھی ندیم بھیا اور اکثر و بیشتر پیارے ندیم کہہ کر ان خطوں میں مخاطب کرتا تھا۔ مندرجہ ذیل اقتباسات منٹو کی ذہنی الجھنوں اور داخلی ناآسودگی کے آئینہ دار ہیں۔

"مجھ میں بحیثیت انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں۔ اس سے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں"(۱۰ مئی ۱۹۳۹ء)

"طبیعت پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب و غریب تکان سی طاری ہے۔ دراصل آج کل میں اس جگہ پہونچا ہوں جہاں انکار و یقین میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ جہاں آپ سمجھتے بھی ہیں اور نہیں بھی سمجھتے۔" "کچھ بھی ہو مجھے اطمینان نصیب نہیں ہے۔ میں کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہر شے میں مجھے ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ میں خود اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ ہوں جو کچھ میرے اندر ہے وہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بجائے کچھ اور ہی ہونا چاہیے"(۴ جنوری ۱۹۳۹ء)

"میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پلستر ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ کر دوں۔ کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دوں۔ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں۔ میرا نارمل درجۂ حرارت ایک ڈگری زیادہ ہے۔ جس سے آپ میری اندرونی تپش کا اندازہ لگا سکتے ہیں"(۱۲ فروری ۱۹۳۹ء)

"کیا کروں عمر بڑھنے کے ساتھ مجھ میں بچپن آتا جاتا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب گھٹنوں کے بل چلوں گا۔اور تتلا کے باتیں کروں گا۔ لوگ پھیلتے ہیں میں سکڑ رہا ہوں"

(۲۶ جون ۱۹۳۹ء)

"بہت شراب پینے لگا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ کچھ لکھوں۔ پی کر میں لکھ بھی نہیں سکتا۔ دراصل میں اپنے اندر وہ بات ڈھونڈ رہا ہوں جو مجھے کرنا ہے۔ اگر مجھے یہی کرنا ہے جواب تک کر چکا ہوں تو یہ کچھ بھی نہیں۔ یعنی کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔" (۱۰ مئی ۱۹۴۳ء)

"تمہاری علالت بہت افسوسناک ہے۔ مگر یہ اور بھی افسوسناک ہے کہ میں اب کسی کی علالت کے دُکھ کو محسوس نہیں کر سکتا۔ شاید اس لیے کہ میں جسمانی اور روحانی طور پر علیل رہتا ہوں۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے" (ستمبر ۱۹۴۳ء)

"سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ خط لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بے کار جسمانی مشقت کر رہا ہوں۔ کیا اچھا ہوتا اگر آدمی لکھے بغیر اپنے خیالات دوسروں تک پہونچا سکتا۔" (۱۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء)

منٹو کے جنسی رجحانات

عورت کے جسم کے وہ حصّے منٹو کو دعوت نظارہ نہیں دیتے جو شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں ۔اس کی کشش ان اعضا سے ہوتی ہے جن کا جنسی تسکین کے وسیلوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ منٹو کو مارلن ڈیٹریچ کے پیپر بہت پسند تھے ۔ وہ "مارلن ڈیٹریچ کی ٹانگوں پر مرتا تھا" (رحم دل دہشت پسند)۔ کشمیر میں ایک چرواہی لڑکی کی سفید کہنی منٹو کو بہت بھاگئی تھی۔ وہ "اس لمحے کا انتظار کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک جائے ۔اور مجھے اس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے ۔میں نے سوائے کہنی کے اس کے جسم کا کوئی حصّہ نہیں دیکھا۔ اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لیے لپکتی تھیں ۔ایک بار وہ اپنی ہتھیلی میں مصری کی ڈلی چھپائے ہوئے تھی اور جب اس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی سامنے کردی تو مصری کی ڈلی اس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی"۔مصری کی ڈلی منٹو کی گود میں ڈال کر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی ۔" وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیص کی جیب میں پڑی رہی ۔پھر میں نے اپنے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں ۔"عصمت چغتائی نے منٹو کو چھیڑنے کی غرض سے کہا "کس قدر پھُس پھُسا ہے آپ کا عشق"۔ "قطعی پھس پھسا نہیں" منٹو لڑ پڑا ۔"مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے ۔بڑا تیر مارا"۔ "تو اور کیا کرتا ۔اس کے ساتھ سو جاتا ۔ایک حرامی پلا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا"۔ منٹو نے بگڑ کر کہا (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔ فلمی دنیا میں حسین وجمیل، شوخ وشنگ اور اکثر کھل کھیلنے والی ایکٹرسوں کے بیچ رہ کر بھی منٹو نے کسی سے دل نہ لگایا ۔بعض ایکٹرسوں سے اس کی اچھی دوستی ہوگئی ۔لیکن ہر طرح کی آلائشوں سے پاک ۔ "بن کی سندری" فلم کی ایکٹرس نیلم کو جب منٹو نے پہلی بار دیکھا تو اس کی نگاہ صرف نیلم کے پاؤں پر

پڑی۔ "میں پیشہ ور عورتوں کو جو آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ اگر کوئی عورت ایک دم میرے سامنے آجائے تو مجھے اس کا کچھ نظر نہیں آتا" (نیلم)۔ نیلم سے منٹو کی گہری دوستی ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ بقول منٹو "اس کی عجیب و غریب انفرادیت تھی۔ اس میں دوسری عورتوں کی طرح اوچھا پن نہیں تھا۔ اس کی سنجیدگی بہت پیاری چیز تھی"۔ منٹو کو اس کی جلد "جو بہت صاف اور ہموار تھی" "پسند تھی۔ ایک روز منٹو نے نیلم کو جارجٹ کی بے داغ سفید ساری میں ملبوس دیکھا۔" بلاؤز سفید لین کا تھا جو اس کی سانولی اور سڈول باہوں کے ساتھ ایک نہایت خوشگوار اور مدھم سا تضاد پیدا کر رہا تھا۔ "اسی طرح ایک دوسری ایکٹرس 'پارو دیوی' سے منٹو کی دوستی ہوگئی۔ "وہ بہت ہی ہنس مکھ اور گلو مٹھو ہوجانے والی طوائف تھی"۔ منٹو اس کی شائستگی، ستھرا پن اور صاف جلد کا گرویدہ ہوگیا۔ "چھوٹی آستینوں والے پھنسے پھنسے بلاؤز میں اس کی ننگی باہیں ہاتھی کے دانتوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ سفید، سڈول، متناسب اور خوبصورت جلد میں ایسی چکنی چمک تھی جو دیودار لکڑی پر رندا پھیرنے سے پیدا ہوتی ہے"۔ "صبح اسٹوڈیو آتی نہائی دھوئی، صاف ستھری، اجلی، سفید، ہلکے رنگ کی ساڑی میں ملبوس۔ شام کو جو گھر روانہ ہوتی تو دن گذرنے کے گرد و غبار کا ایک ذرہ تک اس پر نظر نہیں آتا۔ ویسی ہی تر و تازہ ہوتی جیسی صبح کو تھی" (پارو دیوی)۔ منٹو نے جب شاہد لطیف کو بتایا کہ اُسے پارو دیوی کی جلد بہت پسند ہے" تو شاہد لطیف نے مسکرا کر کہا۔ جلد پسند ہے ٹھیک ہے۔ لیکن تمھیں کیا معلوم اندر کتاب کیسی ہے۔ مضمون کیسا ہے"۔ حقیقت میں منٹو کو اندر کی کتاب یا اس کے مضمون سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ منٹو کا جگری دوست 'شیام' فلم ایکٹرس کلدیپ کور سے پینگ بڑھا رہا تھا۔ شیام کے ساتھ منٹو کا اس سے ملنا جلنا ہوتا تھا۔ لیکن کلدیپ کور سے منٹو کی "کچھ رسمی ملاقات سی رہی" (کے کے)۔ بابو راؤ کے خاکے میں منٹو ایک بہت ہی شریف ایکٹرس پدما دیوی کا ذکر کرتا ہے "میرے اس کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن اس کا صحیح جسمانی تعلق بابو راؤ پٹیل سے تھا"۔ اسی پدما دیوی نے منٹو کی شادی کے موقع پر منٹو کی والدہ کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اور منٹو کی بیوی کو کوئی زیور وغیرہ بھی دیا تھا (بابو راؤ پٹیل)۔

فلم ایکٹرسوں کی عریانی، اعضا کی اشتعال انگیز نمائش، ان کا سوقیانہ پن، منٹو کے اندر کراہت پیدا کرتا تھا۔ ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ کے موقع پر منٹو نے نورجہاں کو

دیکھا تو اس کی "آنکھوں کو زبردست دھکا لگا۔ عجیب و غریب لباس پہنے تھی ،، جس میں آنکھوں کے لیے بڑی خارش پیدا کرنے والی حدت تھی"۔ نور جہاں نٹ (جالی) کی "لاکھوں کھڑکیوں والی شلوار پہنے تھی جس میں اس کی ٹانگیں بغیر کسی تکلف کے چھن چھن کر باہر آرہی تھیں ۔ قمیص بھی اسی کپڑے کی تھی۔ اب آپ ہی اندازہ کیجئے کہ اس لباس نے نور جہاں کو ڈھانکنے کی کتنی کوشش کی ہوگی"۔ "نور جہاں کو اس لباس میں دیکھ کر میں تو واللہ بوکھلا گیا۔ میں نے اپنی زخمی نگاہیں اُدھر سے ہٹالیں اور شوبھنا سمرتھ کے پاس چلا گیا۔ وہ مستور تھی۔ وہ بھی اس فلم میں کام کر رہی تھی ۔ میں اس کے ساتھ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ گیا اور اپنی وہ کوفت اور اپنا وہ تکدر دور کرتا رہا جو نور جہاں کا کھڑکیوں والا لباس دیکھ کر میرے دماغ میں پیدا ہوا تھا" (نور جہاں) ۔ اسی طرح ایک دوسری فلم ایکٹرس ستارہ کا نیم عریاں لباس منٹو کی آنکھوں میں چبھتا تھا۔" وہ ململ کی باریک ساڑھی پہنتی ہے۔ اتنی باریک کہ اس کا سارا ڈھیلا ڈھیلا جسم چھن چھن کر باہر آتا رہتا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے کراہت کا موجب ہوتا ہے"۔ (ستارہ) ۔ نیلم کی چکنی جلد کا منٹو دلدادہ تھا لیکن" جب وہ پہلی مرتبہ اپنا واہیات پارٹ ادا کرنے کے لیے تنگ چولی پہن کر سیٹ پر آئی تھی تو میری نگاہوں کو بہت صدمہ پہونچا" (نیلم)

فلمی زندگی کا چلتا پھرتا معاشقہ، شادی شدہ جوڑوں کا اپنے شوہر یا اپنی بیوی پر قناعت نہ کرکے دوسروں کی بیویوں اور شوہروں کے ساتھ کھلم کھلا گل چھرے بازی، منٹو کے اندر عجیب اکتاہٹ اور بدمزگی پیدا کردیتی تھی۔" عجیب سلسلہ تھا کہ محسن عبداللہ سینہ پر بھاپر دھان کے عشق کے چکر میں تھا۔ اس کی بیوی پر احمد اپنا سکہ جمائے ہوئے تھا۔ ادھر احمد کی بیوی صفیہ سبط حسن سے رومان لڑا رہی تھی، اور ان کے جاننے پہچاننے والوں میں بھی اسی قسم کا سلسلہ جاری تھا"۔ " میں نے جب یہ سلسلہ دیکھا تو بخدا چکرا گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔ میاں یہاں بیٹھے ہیں اور ان کی بیوی کسی اور سے ٹانکا جاتی کر رہی ہے ۔ ایک شوہر اپنے سنہرے جلوے کی بیاہی بیوی کو چھوڑ کر کسی ایکٹرس کے پیچھے پیچھے مارا پھر رہا ہے" (پُراسرار نینا) ۔ فلمی دنیا کا مشہور موسیقار "رفیق غزنوی" کی بے عنان ہوس پرستی کا ذکر کرتے ہوئے منٹو کہتا ہے" رفیق پرلے درجے کا بے غیرت، کہنے کو پٹھان، مگر غیور قطعاً نہیں ۔ سنا ہے کہ پہلے اس کا سلسلہ زہرہ کی ماں سے تھا۔ اس کے بعد اس کی بڑی لڑکی مشتری سے ہوا۔ پھر زہرہ کی باری آئی۔ آخر میں شیدان کی"۔ رفیق کی بیاہتا بیوی سے جو لڑکی طاہرہ

تھی اس کے ساتھ بھی رفیق کا تعلق تھا۔" نذیر لدھیانوی کو طاہرہ نے دھوکہ دیا، طاہرہ کو ضیا سرحدی نے، اب وہ اپنے سب سے بڑے خاوند..... اپنے باپ رفیق غزنوی کے پاس ہے۔" رفیق کی اس حیوانیت پر اپنے ردِ عمل کا اظہار منٹو اس فلسفیانہ انداز میں کرتا ہے۔" غیرت، شرم اور حیا شاید اضافی چیزیں ہیں۔ آپ مجھ سے بحث کریں گے تو میں مان لوں گا کہ یہ واقعی ہیں۔ بہن بھائی کے ازدواجی رشتے میں کیا قباحت ہے؟ باپ بیٹی کے جسمانی تعلق میں کیا برائی ہے؟ اسی طرح اغلام بازی کو خلاف وضع فطری عمل کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ جب کہ یہ رجحان انسانی فطرت میں ازل سے موجود ہے۔ کچھ بھی ہو۔ آپ مجھے کمزور کہہ لیجئے۔ رجعت پسند بنا دیجئے۔ لیکن ان باتوں کے تصور ہی سے مجھے گھن آتی ہے"(رفیق غزنوی)۔ رفیق کی بوالہوسی پر اپنے برانگیختہ جذبات کے متعلق منٹو ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے جو اس کے دلی دوست بلدیہ صاحب کی معیت میں پیش آیا تھا۔ ایک رات منٹو کو بلدیہ صاحب کے ساتھ ان کی محبوبہ اختر اور اس کی چھوٹی بہن انور کے بالاخانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔" مجرا سننے کے بعد باتیں شروع ہوئیں تو رفیق غزنوی کا ذکر آیا۔" منٹو نے کہا "حرام زادہ ہے"۔ چھوٹی بہن انور نے "ایک تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ" منٹو کی طرف دیکھا اور کہا" آپ کی شکل اس سے ملتی جلتی ہے"۔ منٹو سے کوئی جواب بن نہ آیا اور پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔" (رفیق غزنوی)۔ واقعی منٹو کی رفیق سے بڑی مشابہت تھی۔ جب وہ امرتسر میں تھا ایک پان والے نے اسے رفیق غزنوی سمجھ کر پان کے باقی پیسوں کا حساب چکانے کو کہا تھا۔ منٹو اس سے پہلے رفیق غزنوی کو نہیں جانتا تھا۔ جب پان والے نے بتایا تھا کہ اس کی اور رفیق کی شکل بہت ملتی جلتی تھی تو منٹو کو رفیق غزنوی سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ (رفیق غزنوی)

منٹو کے دل میں ان لوگوں کی بڑی عزت تھی جو اپنے نفس پر قابو کر کے شادی کی بندشوں سے اپنے کو آزاد رکھتے ہیں اور جنسی لذت کے مستحسن وسیلے سے بھی اپنے کو محروم کر دیتے ہیں۔ اس کے دو افسانوں کے مرکزی کردار ' ددوا پہلوان' اور ' ممد بھائی ' دونوں ہی لنگوٹ بند تھے۔" ددوا پہلوان گانا سنتا تھا۔ شراب پیتا تھا۔ طوائفوں سے فحش مذاق کرتا تھا۔ مگر اس سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔" ددوا کو اپنی طاقت پر ناز نہیں تھا۔ اسے یہ بھی گھمنڈ نہیں تھا کہ وہ چھری مارنے کے فن میں یکتا ہے۔ اس کو اپنی ایمانداری اور اپنے خلوص پر کوئی فخر نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی اس بات پر بہت نازاں تھا کہ لنگوٹ کا پکا ہے۔ وہ

اپنے دوستوں اور یاروں کو ابتہاج و فخر سے سنایا کرتا کہ اس کی جوانی میں سینکڑوں مرد اور عورتیں آئیں۔ چلتروں نے بڑے بڑے منتر اس پر پھونکے مگر وہ ..... شاباش ہے اس کے استاد کو لنگوٹ کا پکا رہا۔" " یہ بڑ نہیں تھی۔ ان لوگوں کو جو ددوے پہلوان کے لنگوٹیئے تھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا دامن عورت کی تمام الائشوں سے پاک رہا ہے۔ متعدد بار کوشش کی گئی کہ وہ گمراہ ہو جائے مگر ناکامی ہوئی۔ وہ ثابت قدم رہا۔" (ددوا پہلوان) منٹو جن جذباتی الفاظ میں ددوا کے اس وصف کو بیان کر رہا ہے ان سے ظاہر ہے کہ ددوا کی شخصیت منٹو کے دماغ میں ایک گرانمایہ حیثیت رکھتی تھی۔ اسی طرح منٹو اپنے افسانے 'ممد بھائی' میں اُس کے کردار 'ممد بھائی' کی عورتوں کے معاملے میں پاکبازی پر شدید تاثر کا اظہار کرتا ہے۔ "وہ بہت بڑا دادا یعنی بدمعاش تھا۔ لیکن باوجود اس کہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔ عورتوں کے دُکھ درد کا شریک ہے۔ عرب گلی ہی نہیں، آس پاس جتنی گلیاں ہیں ان میں جتنی نادار عورتیں تھیں سب ممد بھائی کو جانتی تھیں کیوں کہ وہ اکثر کی مالی امداد کرتا ہے۔ لیکن وہ خود ان کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔ اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا تھا اور ان کی خبر دریافت کر لیتا تھا" (ممد بھائی)۔ منٹو ممد بھائی پر بھی ویسے ہی جذباتی انداز میں اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کر رہا ہے۔

فلمی دنیا میں منٹو کی بہتوں سے دوستی ہوئی۔ اپنے خاکوں میں اس نے ان میں سے اکثر کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن جس خلوص اور محبت کا اظہار اس نے اشوک کمار کے ساتھ کیا ہے کسی دوسرے کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ اشوک کمار کی شخصیت میں اُسے کوئی نقص نظر نہیں آیا۔ حالانکہ منٹو کی نگاہ اپنے ملنے والوں کی خوبیوں اور برائیوں دونوں پر پڑتی تھی۔ اور وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ رفیق غزنوی جس کے لیے منٹو کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا کہ "حرام زادہ ہے"، جس نے اسے بری طرح ذلیل کیا تھا اُس کے بارے میں بھی منٹو چند تعریفی جملے استعمال کرنے سے باز نہیں آتا۔" اس کے ایک گُن کا معترف ہوں۔ وہ بے شرم ہے۔ بے حیا ہے۔ بے غیرت ہے۔ لیکن ادباش نہیں۔ اس کی افتاد عام آدمی کی نہیں ایک آرٹسٹ کی افتاد ہے۔ وہ اگر شریعت کا پابند نہیں تو مروجہ قانون کا ضرور پابند ہے۔ وہ اگر کسی کا دوست نہیں تو کسی کا دشمن بھی نہیں۔ وہ اگر صحیح معنی میں کسی کا شوہر نہیں ہے تو آج تک

اُس نے کسی کو مجبور نہیں کیا کہ وہ صحیح معنی میں اس کی بیوی بنے" (رفیق غزنوی)۔ شیام سے منٹو کی بہت زیادہ گہری دوستی تھی۔ شیام کے اس پر بڑے احسانات تھے جنھیں منٹو بھول نہیں سکتا تھا۔ شیام کی موت کی خبر سُن کر منٹو پر جو گزری اُسے اس نے اس طرح بیان کیا ہے "شیام زندہ ہے اپنے دو بچوں میں جو اس کی بے لوث محبت کا نتیجہ ہیں۔ تاجی (ممتاز) میں جو بقول اس کے اس کی کمزوری تھی۔ اور ان تمام عورتوں میں جن کی اوڑھنیوں کے آنچل اس کے محبت بھرے دل پر گاہے گاہے سایہ کرتے رہے اور میرے دل میں جو صرف اس لیے سوگوار ہے کہ وہ اس کی موت کے سرہانے یہ نعرہ بلند نہ کرسکا' شیام زندہ باد" (مرلی کی دھن)۔ لیکن شیام سے جب منٹو کی لاہور میں آخری ملاقات ہوئی تو منٹو نے اس کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی اور خواب کے عالم میں اس پر جن لعنتوں کی بارش کی اس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ اشوک کمار کے لیے اپنے خاکے میں منٹو نے ایک بھی تحقیر آمیز جملہ استعمال نہیں کیا ہے اور نہ کبھی اس کے معاملے میں کسی تلخی کا اظہار کیا ہے۔ اشوک نے اس کی کہانی پر نذیر احمد اجمیری کی کہانی کو ترجیح دے کر منٹو کو آزردہ کیا تھا اور بقول اوپندر ناتھ اشک اور عصمت چغتائی' اشوک کے ہاتھوں اس کی ناقدری نے منٹو کو بمبئی چھوڑ کر پاکستان چلے جانے کی ترغیب دی۔ لیکن خود منٹو نے ان باتوں کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ منٹو اشوک کمار کی خانگی زندگی سے بہت متاثر تھا۔" اشوک جب ریس میں جاتا تھا تو اس کی حسین و جمیل بیوی 'شوبھا' تین بچوں کی ماں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی۔" "شوبھا گھریلو عورت ہے۔ تعلیم واجبی ہے۔ اشوک کہا کرتا ہے کہ وہ اَن پڑھ ہے مگر صرف ازراہِ مذاق۔ اس کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب ہے۔ شوبھا اتنی دولت ہونے کے باوجود ہمیشہ گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی ہے۔ ٹھیٹ بنگالیوں کی طرح' سوتی دھوتی پہنے اور اس کے پلّو کے ایک کونے میں چابیوں کا ایک بڑا گچھا اڑسے وہ مجھے ہمیشہ اپنے گھر میں مصروف کار نظر آتی ہے۔" اشوک کے بارے میں منٹو لکھتا ہے کہ "محبت سے وہ قطعاً ناآشنا ہے۔ سینکڑوں حسین لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں۔ لیکن وہ نہایت روکھے انداز میں ان سے پیش آیا۔ دیو یکا رانی نے اس سے عشق کرنا چاہا۔ مگر اس نے نہایت غیر عاشقانہ انداز میں اس کی حوصلہ شکنی کی۔ ایک اور ایکٹرس نے جرأت سے کام لے کر اسے اپنے گھر بلایا۔ اور بڑے نرم و نازک طریقے سے اس پر اپنی محبت کا

اظہار کیا۔ مگر اشوک نے بڑے بینڈے پن سے اس کا دل توڑ دیا۔" "سیکڑوں لڑکیوں نے جرأت رندانہ سے کام لے کر اس کو عشق میں کودنے کی ترغیب دی۔ اس کی ذاتی ڈاک میں بلا مبالغہ ہزاروں عورتوں کے عشق و محبت سے لبریز خطوط آتے ہوں گے۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں خط کے اس انبار میں سے شاید ایک سو بھی اس نے خود نہیں پڑھے"۔ اشوک کی اس رہبانیت میں اشوک کمار کے ساتھ منٹو کی عقیدت کا راز پوشیدہ تھا۔

منٹو کو خود بھی اپنے گرفتارِ محبت نہ ہونے کا زعم تھا۔ اس کے افسانے "بلونت سنگھ مجیٹھیا" کے کردار' شاہ صاحب نے جب اپنے عشق کی داستان منٹو کو سناتے ہوئے کہا۔" منٹو صاحب یہ عاشق ہونا بھی عجیب بات ہے"۔ تو منٹو یہ سُن کر مسکرا دیا اور بولا آپ ٹھیک فرماتے ہیں شاہ صاحب، لیکن افسوس ہے کہ میں اس لعنت میں ابھی تک گرفتار نہیں ہوا"۔ (بلونت سنگھ مجیٹھیا) محسن عبداللہ جو بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا اس سے ایک دن منٹو سے ملاقات ہوئی تو منٹو نے اس سے پوچھا" سناؤ یار مس پردھان کا کیا حال ہے"؟ محسن عبداللہ نے زہرِ قند کے ساتھ جواب دیا" ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب اس سے خواجہ احمد عباس عشق لڑا رہا ہے۔ اس عورت کو آپ نہیں جانتے۔ وہ عورت نہیں سیفٹی ریزر ہے۔ وہ بھی ایسا کہ اس کے مونڈے ہوئے بال کبھی نہیں آگتے"۔ منٹو سوچنے لگا کہ اس کے "جسم پر بے شمار بال ہیں"۔ اگر یہ سیفٹی ریزر میرے ہاتھ آ جائے تو کتنی جلد اس لعنت سے بچ جاؤں۔ مگر خدا کا شکر ہے میں نے کوشش نہیں کی ورنہ میرا بھی حشر وہی ہوتا جو محسن عبداللہ اور خواجہ احمد عباس کا ہوا۔ خواجہ گنجا ہو گیا اور محسن کے بال بھی جھڑنے لگے"۔

اشوک کمار کے علاوہ فلمی دنیا کی ایک دوسری شخصیت جس سے منٹو متاثر معلوم ہوتا ہے وہ رام سروپ کی تھی۔ "فلمی دنیا کا ایک منجھا ہوا ایکٹر"۔ " فلمی دنیا میں اسکنڈل عام ہوتے ہیں۔ آئے دن سننے میں آتا ہے کہ فلاں ایکٹر کا فلاں ایکٹرس سے تعلق ہو گیا۔ فلاں ایکٹرس فلاں ایکٹر کو چھوڑ کر ڈائرکٹر کے پہلو میں چلی گئی ہے۔ قریب قریب ہر ایکٹر اور ایکٹرس کے ساتھ کوئی نہ کوئی رومان جلد یا بدیر وابستہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ہیرو کی زندگی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ان بکھیڑوں سے پاک تھی" (خالی بوتلیں خالی ڈبے) رام سروپ کو عورتوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی" یہ بات منٹو کو بہت اچھی لگی تھی اور وہ رام سروپ سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔

پاکستان میں نور جہاں مشہور مغنیہ' کے پرستاروں کا ذکر کرتے ہوئے' منٹو لکھتا ہے
اُس کے لیے لاہور کا حجام اپنی ران کا نہیں تو اپنے بازو کا پاؤ بھر گوشت دے سکتا ہے۔
اس کا چار برس کا عاشق شاہد جلال (منٹو کے بھانجے کا لڑکا جس کو سب پیار سے ٹاکو کہتے
تھے) عرف ٹاکو ہے۔ جو ہر وقت اس کو دلہن بنانے کا خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وہ باورچی بھی
جو اس کی تصویر چولہے کے پاس رکھ کر کھانا پکاتے ہیں' جو برتن مانجھتے وقت اس کے گائے
ہوئے گانے اپنی کن سری آواز میں گاتے ہیں اور یوں اپنی مشقت کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔
اور ایک میں ہوں جو اس کی واہیات انگیا دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ معلوم نہیں وہ
اتنی اٹھان میں کیا خوبصورتی دیکھتی ہے اور سید شوکت حسین رضوی اس زیادتی کی اجازت
کیوں دیتا ہے جو باذوق نگاہوں پر بہت گراں گذرتی ہے۔" (نور جہاں)

منٹو کو رومان سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اور محبت کا مفہوم بھی اس کے لیے جداگانہ
تھا۔ "منٹو نے کچھ رومانی افسانے بھی لکھے ہیں لیکن خود منٹو نے ان افسانوں کو اہمیت نہیں
دی ہے۔ اور اس لیے انھیں دماغی عیاشی کی پیداوار بتاتا ہے۔" (منٹو کی حقیقت نگاری)۔
عبادت بریلوی نے منٹو کی ایک تحریر کا حوالہ دیا ہے جس میں منٹو کہتا ہے "مجھے اپنے
بہت افسانے یاد نہیں اور خاص کر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی تھے۔ میں اپنی زندگی میں
بہت کم عورتوں سے ملا ہوں۔ وہ افسانے۔ جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں وہ یا تو
کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لیے۔ میرے ایسے
افسانوں میں چوں کہ خلوص نہیں ہے اس لیے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایک
خاص طبقے کی عورتیں مری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں
مگر وہ رومانی نہیں ہیں" (منٹو کی حقیقت نگاری)۔ عصمت چغتائی کے چھیڑنے پر منٹو نے محبت
کے متعلق جو تصور پیش کیا ہے وہ محبت کے عام مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔ منٹو نے
جب صفیہ کے غائبانہ میں اس کا کئی بار ذکر کیا تو عصمت نے رازداری کے انداز میں پوچھا
"آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے۔" عصمت کا بیان ہے کہ محبت کا لفظ سن کر "وہ چیخ پڑا
جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔" "مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔ میں محبت کا قائل نہیں۔ محبت
سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے۔ بہن
اور بیٹی سے بھی۔۔۔ بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چپلوں اور بوٹ جوتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے
ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے۔" (منٹو میرا دوست میرا دشمن)

منٹو کی فحش نگاری

منٹو اپنی فحش نگاری کی وجہ سے صرف بدنام ہی نہیں ہوا۔ اس پر چار مقدمے چلے۔ تین مقدمے اس کے افسانوں کالی شلوار، دھواں اور بو پر پاکستان کے قیام سے پہلے ہندوستان میں چلے (لذت سنگ) چوتھا مقدمہ ٹھنڈا گوشت کی اشاعت پر پاکستان میں چلا (زحمت مہر درخشاں) ان مقدموں کی وجہ سے منٹو بڑی بڑی پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ اس کے عریاں افسانوں کی دو خصوصیتیں ہیں۔ ان میں سے اکثر افسانوں میں، منٹو عورت کے سینے کا مختلف پہلوؤں سے ذکر کرتا ہے اور بعض افسانوں میں اس کی تکرار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کے خیال میں عورت کے جسم کا سب سے مرغوب اور پرکشش حصہ اس کا سینہ ہی ہے۔ ان افسانوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے منٹو ان میں اپنے آپ کو پیش نہیں کرتا۔ منٹو کے بہت سارے افسانے ایسے ہیں جن میں منٹو خود کو بھی دوسرے کرداروں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے جیسے بابو گوپی ناتھ، ممی، جانکی، نیلم، ممد بھائی، رام کھلاون وغیرہ۔ بعض دوسرے افسانے ایسے بھی ہیں جن میں منٹو واحد متکلم کا تو استعمال کرتا ہے لیکن اس کی حیثیت محض تماشائی کی ہوتی ہے، یا افسانے کا مرکزی کردار اپنی کہانی اس کو سناتا ہے۔ مثلاً بلونت سنگھ مجیٹھیا، جاؤ حنیف جاؤ، ساڑھے تین آنے، چغد، نطفہ، پیرن، تقی کاتب، ٹوٹو وغیرہ۔ ان افسانوں میں منٹو کا قلم کوئی ایسی لغزش نہیں کرتا جس کی بنا پر منٹو پر فحش نگاری یا عریانی کا الزام لگایا جا سکے۔ فحاشی یا عریانی منٹو کے انھیں افسانوں کا خاصہ ہوتی ہے جن میں وہ واحد متکلم کا استعمال کسی حیثیت سے بھی نہیں کرتا۔

جن افسانوں میں منٹو نے عورت کے سینے اور اس کی جزویات پر اپنے قاری کو دعوت نظارہ دیا ہے ان کی خاصی تعداد ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاید ہی اردو کے کسی افسانگار

نے عورت کے سینے کی ایسی تفصیلی تشریح و بیان اتنے تواتر سے کیا ہوگا۔ مندرجہ ذیل افسانوں کے اقتباسات اس کی مثال پیش کر رہے ہیں۔

کتاب کا خلاصہ۔ "بڑی نرمل قسم کی چھاتیاں دھڑک رہی تھیں" "سعیدہ کا سینہ اور بملا کی نرمل چھاتیاں، جیسے ان کا دودھ الگ کر کے صرف پانی رہنے دیا گیا ہے۔" "اُس کی جیتی جاگتی چھاتیاں آ۔ بنو سیسی گولوں کی صورت میں اس کے سفید نینوں کے دو ٹھوں کے پیچھے بڑا دل کش تضاد پیدا کر رہی تھیں"۔

دو قومیں۔ "گیلے سینے پر پانی کے قطرے پھسل رہے تھے۔" "شاردا کے دوپٹے کے پیچھے اُس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔"

ہتک۔ "وہ روپے … اس کی چست اور تھوک بھری چولی میں نیچے سے اُوپر کو اُبھرے ہوئے تھے۔" "اُس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔" "اس کی چھاتیاں چوں کہ کافی اُبھری ہوئی تھیں۔" "سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔" "نیچے سے ان بمب کے گولوں کو باندھ کر رکھ۔ انگیا پہنا کرے گی تو اُس کی سختائی ٹھیک رہے گی"۔

شانتی۔ "اُس کا سینہ جیسے گہری نیند سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

پھاہا۔ "اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹکی پر صابن کا چھوٹا سا بلبلہ لٹکا ہوا ہے"۔

سوکنڈل پاور بلب۔ "اُس کا سینہ سانس کے اُتار چڑھاؤ سے ہل رہا تھا۔"

ٹھنڈا گوشت۔ "کچھ بہت زیادہ اُوپر کو اُٹھا ہوا سینہ۔" "اُس کے اُبھرے سینے کو مسلنے لگا۔" "اُبھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا۔" "چوس چوس کر اُس کا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا"

دھواں۔ "کلسم اُس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی"۔

بو۔ "وہ گانٹھ اُس کے تندرست سینے کے ننھے لیکن سمٹے گرہوں میں چھپ گئی تھی۔" "دودھ کی چھاتیاں ایک دم سے نمایاں ہو گئیں۔" "اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو باہر نکال کر کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل بنا دی ہے۔" "اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدگداہٹ، وہی دھڑکن، وہی گولائی، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ برتنوں میں ہوتی ہے۔"

"اُس کے سینے پر یہ اُبھار دو دیے معلوم ہوتے تھے۔" "رندھیر کے ہاتھ ساری رات اُس کی چھاتیوں پر ہوا کے جھونکوں کی طرح پھرتے رہے۔" "چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے گول دانے جو چاروں طرف ایک سیاہ دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے ان ہوائی جھونکوں سے جاگ اُٹھتے۔" "کئی لڑکیوں کے نازک اور سخت سینوں میں اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی کتنی راتیں گزار چکا تھا۔" "چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں" "سینے پر جھریاں سی پڑی ہوئی تھیں۔" "اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پڑ گئی تھیں" "اُس گوری لڑکی کے کچے دودھ کی طرح سفید سینے پر ہوا کے جھونکوں کی طرح پھرتے رہے تھے۔" "جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا۔" "ٹھیک ویسی ہی جیسی اُس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اس کو نظر آئی تھی۔

سڑک کے کنارے۔ "اُس کے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کے محرابوں جیسی تقدیس کیوں آ رہی ہے؟" "میرے سینے کی گولائیاں پیالی پیالی بن رہی ہیں۔" "میری دودھ بھری ہوئی چھاتیوں سے پوچھو۔"

موذیل "چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند لوریں چڑھنے کی ضرورت تھی۔" اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔" "ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں، ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے گئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل اُبھر آئے۔" "کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ٹھوکا دیا۔" "اُسے اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا۔" "اس کا بازو اُس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔"

شاردا۔ "ایک بار شاردا کی دودھ بھری چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ کر رہ گئے تھے۔" "اُس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں۔ یعنی ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آبِ حیات۔"

شادی۔ "ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی جس کی چھاتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں۔"

بچنی۔ "اُس کی چھاتیاں جو بڑی تند خو تھیں اور اس طرح اُوپر اُٹھی رہتی تھیں جیسے ابھی اپنا سارا جوبن آپ پر داغ دیں گی۔" "اُس قدر نیچے ڈھلک گئی تھیں کہ ان کا نام و

نشاں بھی نہیں ملتا تھا۔" "چھاتی ایسی تھی جیسے لوہے کی بنی ہے"۔

وہ لڑکی۔ "وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس میں وہ تمام قوسین اور وہ تمام خطوط موجود تھے جو ایک جوان لڑکی میں موجود ہوتے ہیں"۔ "سُریندر نے اٹھ کر دراز دستی شروع کی۔ اس کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا"۔

محمودہ۔ "مستقیم نے دیکھا کہ اس کا سینہ بہت ٹھوس اور مضبوط تھا"۔

پری۔ "اس نے اپنے گیلے کرتے کو دیکھا۔ جن میں دو کالے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے"۔ "پرویز کے گیلے کرتے کے ساتھ چمٹے ہوئے دو کالے دھبے اس کو دو آنکھیں لگتے تھے"۔

یہ سارے افسانے منٹو کی عریاں نگاری کی مثال پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی افسانے میں بھی منٹو نے خود کو کسی حیثیت سے بھی پیش نہیں کیا ہے۔ اسی طرح وہ دو افسانے جن کا موضوع باپ بیٹی کا جنسی تعلق ہے 'کتاب کا خلاصہ' اور 'اللہ دتا' ان میں بھی منٹو نے اپنے کو پیش نہیں کیا ہے۔ ان کے برخلاف وہ افسانے جن میں منٹو نے واحد متکلم کا استعمال کیا ہے فحاشی یا عریانی کا کوئی نشان نہیں رکھتے۔ ان میں بعض افسانے ایسے ہیں جن میں عریاں نگاری کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ جیسے ممی۔ اس میں کئی اینگلو انڈین لڑکیوں کا ذکر ہے۔ سعیدہ کاٹج کی عیش و نشاط کی محفلوں میں یہ شریک رہا کرتی تھیں۔ ان رنگ رلیوں میں جو مرد شامل ہوتے تھے وہ ان لڑکیوں سے گھل مل کر گپیں اڑاتے لیکن شراب کے پگ کے پگ حلق سے اتار لینے کے باوجود ان کی کسی ایسی حرکت کا بیان نہیں ملتا جس پر فحاشی کا الزام لگایا جا سکتا۔ لڑکیوں کے لباس اور ان کی وضع قطع سے بھی ان کے جسم کے کسی حصے کی عریانی یا بے ستری کا نشان پورے افسانے میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اسی طرح جب بابو گوپی ناتھ کی شہوت پرستی کا ذکر چھڑتا ہے تو منٹو اتنا کہہ کر گذر جاتا ہے" اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی، کون نٹنی تھی، نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی۔ ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہیں آئیں" (بابو گوپی ناتھ)۔

اسی طرح خاکوں میں بھی منٹو نے اس کی پوری احتیاط برتی ہے کہ اس کا قلم تہذیب کے

دائرے سے باہر نہ جائے۔ اس نے کتنی ایکٹرسوں اور طوائفوں کا ذکر کیا ہے لیکن کسی کے جسم کے کسی ایسے حصّے کی طرف قاری کی توجہ مبذول نہیں کی ہے جو اس کے شہوانی جذبات کو برانگیختہ کر سکے۔ نور جہاں کے نیٹ والے لباس سے صرف اس کی ٹانگوں کے چھن چھن کر باہر آنے کے منظر کا منٹو ذکر کرتا ہے۔ اس کے اسی نیٹ کی قمیص سے اُس کے سینوں کی برہنگی کا جو مظاہرہ ہو رہا ہوگا اس سے منٹو نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے "قمیص بھی اسی کپڑے کی تھی" (نور جہاں)۔ گنجے فرشتے بارہ اور لاؤڈ سپیکر دس خاکوں کے مجموعے ہیں۔ لاؤڈ سپیکر کے صرف دو خاکوں میں ایک جگہ منٹو نے ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جنھیں عریانی سے مناسبت دی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کا مقصد بے شرمی کو دعوت دینا نہیں ہے بلکہ اس پر غیرت دلانا ہے۔ رفیق غزنوی کے خاکے میں منٹو نے عریاں الفاظ میں ایک ایسے رکیک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس کی کراہت نے اس کو بیان کرنے پر منٹو کو مجبور کر دیا تھا۔ منٹو ایک دن امپریل فلم کمپنی کے مالک آرڈیشیر ایرانی سے ملنے گیا" دفتر کا سوئنگ ڈور کھولتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ سیٹھ بڑے اطمینان سے شیدان کا ایک پستان یوں دبا رہا ہے جیسے کسی موٹر کار کا ہارن"۔ (رفیق غزنوی)۔ منٹو اس منظر کو برداشت نہ کر سکا اور" الٹے پاؤں واپس چلا آیا"۔ اس خاکے میں منٹو نے فلمی دنیا کی ساری جنسی بدعنوانیو اور بے راہ رویوں کا ذکر کیا ہے تاکہ اس عصیاں پرور اور اخلاق سوز پس منظر میں رفیق غزنوی کی بداعمالیوں اور حیوانیت کو پوری طرح اُجاگر کر سکے۔ اسی طرح پُراسرار نینا میں منٹو نے ایک جگہ شوہر کی موجودگی میں بیوی کا دوسرے شخص کے ساتھ "چما چاٹی" کا ذکر کیا ہے۔ یہ خاکہ حقیقت میں کسی غیر عورت کے ساتھ جنسی تعلق پر منٹو کے تنفر کا بھرپور اظہار کرتا ہے اور اس طرح اس سے منٹو کے جنسی رجحان کی نشاندہی ہوتی ہے۔

منٹو کے افسانوں میں کلیدی کردار (عورتیں)

سوگندھی۔ منٹو کے افسانے 'ہتک' کی سوگندھی ایک پیشہ ور طوائف تھی۔ وہ پانچ سال سے جسم فروشی کا دھندھا کر رہی تھی۔ اس کا ہر گاہک اپنی محبت کا اسے یقین دلاتا تھا۔ اور " سوگندھی یہ جان بوجھ کر بھی کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا کہ سچ مچ اُس سے پریم کیا جا رہا ہے۔ 'پریم کتنا سندر بول ہے'۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں میں مل لے۔ اُس کی مالش کرے تاکہ یہ سارا کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔" پریم کا جذبہ سوگندھی کی ممتا کو جگا دیتا تھا۔ " جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے۔ اور لوریاں دے کر اُسے اپنی گود میں سلا دے۔" سوگندھی کو مادھو سے محبت ہو گئی تھی جو پونہ میں حولدار تھا۔ وہ ہر مہینہ پونہ سے آتا اور ہر بار واپس جاتے ہوئے سوگندھی سے وعدہ کرتا کہ اگلے مہینے کے خرچ کے لیے اسے روپے بھیج دے گا۔ وہ سوگندھی کو تاکید کرتا تھا کہ وہ اپنا دھندھا بند کر دے۔ لیکن نہ اس نے کبھی روپے بھیجے نہ سوگندھی نے اپنا دھندھا بند کیا۔ بلکہ جب وہ آتا تو سوگندھی ہی اس کی ذات پر دس پندرہ روپے خرچ کر دیتی۔ سوگندھی کو روپے پیسے کا لالچ نہیں تھا" اسے کون سے محل کھڑا کرنے تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کا کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل جایا کرتے تھے جو اُس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے۔"

رات کے دو بجے رام لال دلال نے دروازے پر دستک دی۔ سوگندھی کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ رام لال نے اسے جلد تیار ہونے کو کہا۔ باہر موٹر پر ایک سیٹھ انتظار کر رہا تھا۔ سوگندھی ہرگز راضی نہ ہوتی لیکن اُسے روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ پاس والی کھولی میں ایک مدراسی عورت

رہتی تھی۔ اس کا شوہر موٹر کے نیچے دب کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت وطن جانا تھا، لیکن اس کے پاس روپے نہ تھے۔ سوگندھی نے روپیوں کے بندوبست کرنے کا وعدہ کر دیا تھا۔

رام لال سوگندھی کو سیٹھ کی موٹر کے پاس لے گیا۔ سیٹھ نے ٹورچ کی روشنی میں سوگندھی کو دیکھا۔ روشنی بجھ گئی اور "ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے نکلا "اونہہ"، اور پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا......" رام لال کی آواز سنائی دی "پسند نہ کیا تجھے۔" اور یہ کہہ کر رام لال چلا گیا۔

سوگندھی اپنی ہتک کے احساس سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ لوٹ کر آئی تو کھولی میں مادھو موجود تھا۔ مادھو نے اسے بتایا کہ وہ ایک مقدمے میں پھنس گیا تھا۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اُسے انسپکٹر کو پچاس روپے دینے تھے۔ سوگندھی غضب ناک آواز میں مادھو کو جلی کٹی سنانے لگی۔ مادھو نے سوگندھی کا تیور دیکھ کر بڑے تعجب سے پوچھا "سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے؟" "تیری ماں کا سر۔ تو ہوتا ہے کون مجھ سے سوال کرنے والا؟ بھاگ یہاں سے ورنہ...." سوگندھی کی گرج دار آواز سُن کر اُس کا خارشت زدہ کتا بھونکنے لگا اور اس نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سوگندھی نے خارشت زدہ کتے کو گود میں اٹھا لیا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

شاردا۔ نذیر باوجود شادی شدہ ہونے کے ایک عیاش طبع نوجوان تھا۔ شاردا سے اُس کی پہلی ملاقات کریم دلال نے اُس ہوٹل میں کرائی جہاں اُس نے شاردا کو لاکر رکھا تھا۔ شاردا نے نذیر سے کوئی التفات نہیں کیا۔ نذیر نے اچانک اُس کو اپنے بازو میں سمیٹ کر اس کا منہ چوم لیا۔ شاردا نے اِسے بہت ناپسند کیا۔ اتنے میں ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ شاردا اُٹھی۔ نذیر نے اُسے روکا۔ "وہ ایک دم ماں بن گئی اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ منی رو رہی ہے"۔ شاردا کا شوہر اپنی ایک نشانی اُس کے پاس چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا تھا اور اس کی کوئی کھوج خبر نہ لیتا تھا۔ شاردا بچی کو گود میں اُٹھائے کمرے میں واپس آ گئی۔ بچی کی ناک بہہ رہی تھی۔ نذیر نے کریم کو روپے دیے کہ وہ وِکس کی شیشی بچی کی ناک میں ڈالنے کے لیے لا دے۔ نذیر کو بچے اچھے لگتے تھے۔ اس نے منی کو گود میں لے لیا اس کے بال میں انگلیاں دے کر اس کا سر سہلانے لگا۔ اور شاردا سے کہا کہ "اس کی ماں تو میں ہوں"۔ شاردا کا مادرانہ جذبہ جاگ اُٹھا۔ نذیر کے ساتھ

اُس کا عدم التفات اور بے رخی خوش دلی اور مروّت میں تبدیل ہو گئی۔ شاردا بچی کو اندر چھوڑ آئی۔ اور اب جو نذیر نے اسے سینے سے لگا لیا تو اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ نذیر نے زبردست اصرار کر کے اسے ایک پگ وسکی کا پلا دیا جو وہ بہزار دقت حلق سے نیچے اتار سکی۔ نذیر نے دروازہ بند کر دیا۔ "شاردا نے جسمانی طور پر اس کی پوری تسکین کر دی۔" جاتے وقت نذیر نے بچی کو پیار کیا۔ اور اس طرح ہر روز شاردا کے پاس ہوٹل میں آنے لگا۔

شاردا کو روپیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نذیر روز کریم کو ساٹھ روپے دیتا۔ کریم دس روپے ہوٹل والے کو دے دیتا اور تیرہ روپے اپنے کمیشن کے لے لیتا۔

نذیر کو احساس ہوا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ غداری کر رہا تھا۔ اس نے ایک دن شاردا کو بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اور یہ بھی کہ اس کے روپے ختم ہو گئے تھے۔ دوسرے دن نذیر آیا تو شاردا اس سے نہیں ملی لیکن اس نے کریم کے ہاتھ بہت سے نوٹ بھیج دیے۔ اور کہلوایا کہ روپے نذیر لے لے اور اپنا پتہ اُسے دیدے۔ وہ جے پور چلی گئی۔ کریم نے نذیر کو بتایا کہ شاردا کو نذیر سے محبت ہو گئی تھی اور اگر کریم بیچ میں نہ ہوتا تو وہ نذیر کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہونے دیتی۔

شاردا نذیر کو برابر جے پور سے خط لکھتی رہی۔ وہ بمبئی آنے کو بے قرار تھی لیکن ہوٹل میں ٹھہرنے کو تیار نہیں تھی۔ اتفاق سے نذیر کی بیوی کچھ دنوں کے لیے میکے چلی گئی۔ نذیر نے شاردا کو بلا لیا۔ وہ نذیر کے گھر آ گئی اور دن رات نذیر کی دیکھ بھال اور خدمت میں لگ گئی۔ وہ نذیر کو ہر ممکن طور سے عافیت پہنچانے کی فکر میں رہتی۔ "شاردا کے جسم کا خلوص برقرار تھا۔ لیکن وہ فضا نہیں تھی"۔ نذیر کو "وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوتی تھی"۔ ہوٹل میں جب منی شاردا کے پاس تھی "ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ کر رہ گئے تھے۔ اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا ماں بننا کتنا اچھا ہے۔ مرد کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورتیں کھاتی ہیں تو کھلاتی بھی ہیں۔ کسی کو پالنا۔ اپنے بچے کو سہی کتنی شاندار چیز ہے۔" "اب منی شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔" وہ نامکمل تھی۔ اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں۔ ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آبِ حیات۔"

باوجود اس کے کہ شاردا نذیر کے ساتھ غایت خلوص و محبت کا برتاؤ کر رہی تھی

نذیر کے اندر اکتاہٹ اور چڑچڑا پن پیدا ہو رہا تھا۔ آخر ایک دن نذیر نے شاردا سے کہہ دیا کہ "کل تمھیں یہاں سے روانہ کر دوں گا۔" نذیر صبح میں بنک سے روپے نکلوانے گیا۔ واپس آیا تو شاردا جا چکی تھی۔

جانکی۔ جانکی ایک طوائف تھی۔ اس کے دل میں ایثار و خدمت کا ویسا ہی جذبہ تھا جیسا ایک ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ منٹو کے ایک دوست عزیز نے اسے پشاور سے منٹو کے پاس بھیج دیا تھا کہ وہ اُسے فلم انڈسٹریز میں کوئی جگہ دلوا دے۔ منٹو ان دنوں پونہ میں مقیم تھا۔ جانکی بیس دن پونہ میں رہی لیکن اسے کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ منٹو نے اپنے دوست نرائن اور سعید کے پاس اُسے بمبئی بھیج دیا "تاکہ وہ لوگ کوشش کر کے اسے ملازمت دلوا دیں۔ یہ دونوں بمبئی میں ایک فلم کمپنی میں کام کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی رہتے تھے۔ نرائن نے اپنی کمپنی میں جانکی کو ملازمت دلوا دی۔ جب تک جانکی پونہ میں رہی عزیز کی فکر اسے لگی رہتی تھی۔" پونہ پہونچتے ہی اُس نے عزیز کو ایک تار بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ بلاناغہ ہر روز عزیز کو ایک خط لکھ دیتی تھی۔ ہر خط میں تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ لیتے رہیں۔" عزیز کا وہ اس کی بیوی سے زیادہ خیال کرتی تھی۔ شروع شروع میں منٹو کو جانکی کی یہ باتیں بناوٹی معلوم ہوئیں "لیکن آہستہ آہستہ اس کی بے تکلف باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔ اس کا جب ہی خط آیا جانکی پڑھ کر ضرور روئی۔"

جانکی پونہ سے جب بمبئی جانے لگی تو منٹو نے جانکی سے نرائن کی تعریف کی اور سعید کے بارے میں بتایا کہ وہ نہایت بے رحم انسان تھا "یہاں تک کہ اُسے اپنا بھی کچھ خیال نہیں ہے۔ بدن پر کوئی پھوڑا نکلا ہے۔ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے مگر مجال ہے کہ وہ اُس کی طرف متوجہ ہو۔ پیپ نکل رہی ہے۔ گل سڑ گیا ہے۔ ناسور بننے کا خطرہ ہے لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا۔"

جانکی کو فلم کمپنی میں پانچ سو روپے ماہانہ ملنے لگے۔ وہ دن رات سعید کی خدمت گزاری میں لگ گئی۔ نرائن سے اسے نفرت تھی۔ منٹو جب بمبئی آیا تو نرائن نے اسے بتایا "منٹو تمھیں معلوم نہیں سعید کی کیسی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبر گیری جو پرلے درجے کا بے پروا ہو آسان کام نہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کو بڑی آسانی سے نبھاتی جا رہی

ہے۔ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت وفادار اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صبح اُٹھ کر اس مخدات کو جگانے میں آدھا گھنٹہ وقت صرف کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کراتی ہے۔ کپڑے پہناتی ہے۔ ناشتہ کراتی ہے۔" جانکی نے خود بھی منٹو سے انھیں خیالات کا اظہار کیا۔ "وہ اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔ بہت بے پرواہ ہیں۔ آپ ہنسیں گے۔ مجھے ہر روز ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ پائخانہ گئے یا نہیں۔" منٹو جانکی کی بے لوث خدمت سے بہت متاثر ہوا۔

منٹو پونہ واپس آگیا۔ اس دوران میں عزیز پونہ آیا تو جانکی بھی خبر ملتے ہی پونہ آگئی۔ اور عزیز کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ پونہ پہونچ کر اُس نے منٹو سے سعید کو تار دلوایا۔ "اُس میں اپنے خیریت سے پہونچنے کی اطلاع تھی لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ انجکشن دلوانے کی تاکید تھی۔" چار دن کے اندر جانکی نے سعید کو پانچ تار روانہ کیے لیکن کسی کا جواب نہ آیا۔ بمبئی جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ عزیز کی طبیعت خراب ہوگئی۔ جانکی دن رات عزیز کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا "لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔" پانچویں روز عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا۔ اُس میں لکھا تھا کہ بہت بیمار ہوں۔ تم فوراً چلی آؤ جانکی بمبئی گئی اور تیسرے روز صبح میں پونہ واپس آگئی۔ عزیز اُس سے اس درجہ بدگمان ہوگیا کہ بغیر اس سے ملے اُسے بخار میں تپتا ہوا منٹو کے یہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

جانکی کو برانکائٹس کا مرض ہوگیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ "اگر احتیاط نہ برتی گئی تو جان کا خطرہ ہے۔" دوسرے روز بمبئی سے سعید کا تار آیا اور باوجود منٹو کے منع کرنے کے اسی بیماری کی حالت میں جانکی بمبئی چلی گئی۔ بمبئی سے پونہ جاتے ہوتے وہ چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی "جس کے باعث اُس کی دونوں رانیں بُری طرح چھل گئی تھیں۔"

پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن نے منٹو کو تار بھیج کر بمبئی بلالیا۔ نرائن نے بتایا کہ جانکی جب بندھے ہوئے سامان کے ساتھ پہنچی تو سعید نے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ۔"

جانکی کا برانکائٹس نمونیہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اور وہ ایک ایکسٹرا لڑکی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی تھی۔ نرائن نے فلم اسٹوڈیو کے مالک سے بات کر کے اُسے ہسپتال پہونچا دیا تھا۔ منٹو نے ہسپتال جا کر ڈاکٹر سے جانکی کا حال دریافت کیا تو ڈاکٹر نے بتایا کہ "دونوں پھیپھڑوں پر ورم ہے اور جان کا خطرہ ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس بڑی تکلیف کو

مردانہ وار برداشت کر رہی تھی ۔"

نرائن جانکی کو ہسپتال سے ہٹا کر ایک ہوٹل میں لیوا گیا جس کے دو کمرے اُس نے کرایہ پر لے رکھے تھے ۔ اُن دنوں پنسلن بہت نایاب تھی ۔ نرائن ملٹری ہسپتال کی فرج چوری سے کھول کر پنسلن کے انجکشن اُڑا لے آیا ۔ ہوٹل میں اس نے رات رات بھر جاگ کر زبردستی تین تین گھنٹوں پر کل پندرہ انجکشن دیے ۔ جب پہلا انجکشن پڑا تھا تو جانکی نے نرائن کی طرف سے نفرت سے منہ پھیر کر کہا تھا "سعادت صاحب اسے کہئے کہ یہاں سے چلا جائے ۔"

پانچ انجکشن کے بعد منٹو کو پونہ سے ایک تار ملا اور وہ پونہ چلا گیا ۔ اور جب دس پندرہ دنوں کے بعد منٹو بمبئی لوٹا تو نرائن بھی ابھی تک اسی ہوٹل میں تھا ۔ لیکن نرائن کا کمرہ خالی پایا ۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو نرائن اور جانکی خوش گپیوں میں مشغول تھے ۔ نرائن نے کہا "آؤ یار آؤ بیٹھو اس کرسی پر ۔ لیکن مبارکباد دو مجھے ۔ جانکی نے میرے ساتھ شادی کر لی ہے ۔"

شانتی ۔ شانتی ایک کشمیری یہودی لڑکی ہے جو اپنے گاہکوں سے نہایت بے رخی سے بات کرتی ہے ۔ اُس نے اپنی فیس پچاس روپے رکھی ہے اور فیس وصول کر لینے کے بعد محض کاروباری طور پر اپنے کا استعمال کرنے کی اجازت دیتی ہے ۔ مقبول، ایک غیر شادی شدہ نوجوان کو اس کے دوست بلراج نے شانتی کے بارے میں بتایا کہ وہ روز شام کو پیر یزین ڈیری میں ٹھیک پانچ بجے آتی ہے ۔ اُس کے گاہک یہیں اس سے ملتے ہیں ۔ اصول کی بڑی پکی ہے ۔ "کبھی جھوٹ نہیں بولتی ۔ پرسنل ہائی جین کی بہت قائل ہے ۔ محبت وجبت کی بالکل قائل نہیں ۔ اس معاملے میں دل اس کا برف ہے" ۔ یہ باتیں سُن کر مقبول کو اس کے بارے میں زیادہ جاننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ۔ دوسرے دن وہ پانچ بجے پیر یزین ڈیری پہونچا تو شانتی وہاں موجود تھی ۔ مقبول اُس سے ملا تو اُس نے کوئی اور بات نہیں کی ۔ بس اتنا کہا "ففٹی روپیز پیں آر نو" ۔ مقبول نے روپے حوالے کر دیے ۔ لیکن بجائے اسے کہیں لے جانے کے اُس کے ہوٹل میں جا کر صرف اس سے باتیں کرنے پر بہ مشکل اسے راضی کر لیا ۔ شانتی نے روپے واپس کر دیے اور مقبول کو اپنے ہوٹل کے کمرے میں لے گئی ۔ مقبول کو اُس نے بتایا کہ وہ ایک ڈاکٹر کی لڑکی تھی اور سرینگر ہسپتال میں نرس تھی ۔ ایک لڑکے نے اسے خراب کر دیا اور وہ بھاگ کر بمبئی آ گئی ۔ اُسے اس پیشے سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ ایک سال بمبئی آئے ہوئے ہو گیا تھا ۔ اُس کے پاس کافی روپے جمع ہو گئے تھے ۔ اور ایک کثیر رقم اس نے ریس کھیلنے پر

خرچ کر دی تھی۔ مقبول نے اُسے قاعدے سے لپ سٹک لگانا' بال سنوارنا اور ساری پہننا سکھایا۔ ان باتوں کی شانتی کو پرواہ نہیں تھی۔ مقبول نے ہر دوسرے دن اُس سے ملنا شروع کر دیا۔ لیکن کبھی بھی اُس کے ساتھ کسی طرح کا جنسی اقدام نہ کیا۔ یہ بات اسے عجیب سی معلوم ہوئی اور اسے مقبول سے دل چسپی ہونے لگی۔ وہ حقیقی محبت کی بھوکی تھی۔ اور جب اُسے مقبول کی بے لوث محبت کا یقین ہو گیا تو وہ اس کی ہو گئی۔

زینت۔ زینت افسانہ' بابو گوپی ناتھ' کی ایک کردار ہے۔ اُسے ایک نائکہ کشمیر سے بھگا کر لاہور لے آئی تھی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک عیاش طبع رئیس تھے اور جنھوں نے اپنی دولت عورتوں اور شراب پر برباد کر دی تھی' زینت پر فریفتہ ہو گئے۔ دو سال سے وہ ان کے پاس تھی۔ وہ اسے بمبئی لے آئے تھے۔ اور اس کی عافیت کا ہر طرح خیال کرتے تھے۔ منٹو کے دوست سینڈو نے گوپی ناتھ سے منٹو کی ملاقات ان کے فلیٹ میں کرادی تھی۔ گوپی ناتھ نے منٹو کو زینت سے ملایا۔ وہ اُس کی اس طرح تعریف کرنے لگے "ہے بڑی نیک۔ خدا کی قسم نہ اسے زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کتنی بار کہا کہ جان من مکان بنوا دوں تو جواب دیا 'کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے؟'"۔ بابو گوپی ناتھ جانتے تھے کہ زینت پیشے کے قابل نہیں ہے۔" وہ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں رہتی ہے"۔ جب ان کی دولت ختم ہو جائے گی تو اس کی زندگی خراب ہو جائے گی۔ اس لیے وہ اس فکر میں تھے کہ کسی اچھے آدمی سے زینت کی شادی کرا دیں تاکہ اُس کی زندگی خوش رہے۔

بابو گوپی ناتھ زینت کو بمبئی میں اپنے مصاحب سینڈو اور اس کی داشتہ سردار کے پاس چھوڑ کر روپیوں کا بندوبست کرنے لاہور چلے گئے۔ سینڈو اور سردار ہر روز دو تین گاہک پھانس کر لاتے جس سے سو سوا سو روز کی آمدنی ہو جاتی۔ زینت کو انھوں نے اس فریب میں رکھا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئیں گے۔

زینت منٹو کو بھائی جان کہتی تھی۔ منٹو نے ایک دن زینت سے کہا۔ "تم یہ کیا کر رہی ہو؟" تو اس نے بڑے "الھڑپن" سے جواب دیا "مجھے کچھ نہیں معلوم بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔" منٹو کا جی چاہا کہ دیر تک اسے سمجھائے کہ وہ جو کر رہی تھی ٹھیک نہیں تھا۔ مگر اس لے کچھ نہیں کہا۔ "زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ' بے اُمنگ اور بے جان عورت تھی۔ کمبخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس کے پٹنے والیوں

کا کچھ انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے سخت کوفت ہوئی تھی اسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلیفون سے حد یہ کہ اس صوفے سے بھی جس پر اکثر وہ لیٹی رہتی اُسے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔"

ممی۔ ممی کا نام مسز اسٹیلا جیکسن تھا۔ اس کا خاوند جیکسن پہلی جنگِ عظیم میں مارا گیا تھا۔ اور اس کی پنشن اسٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔ وہ پونہ میں سعیدہ کاٹج کے پاس ایک مکان میں رہتی تھی۔ سعیدہ کاٹج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ یہاں کافی لوگ رہتے تھے۔ سب کے سب فلم کمپنی میں ملازم تھے۔ مسز اسٹیلا کو سب ممی کہتے تھے۔ جب کبھی ان لوگوں کی محفل نشاط جمتی تو سارا انتظام ممی کے تعلق ہوتا۔ ممی اینگلو انڈین لڑکیوں کو جمع کرتی۔ شراب اور گزک کی چیزوں کا بندوبست کرتی۔ منٹو جب ایک بار ان کی محفل میں اپنے دوست چڈہ کی دعوت پر ممی کے گھر پہونچا تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ جو لوگ ممی کے ڈرائنگ روم میں جمع تھے "چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کھلونے لینے گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ ہر شے ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابل فہم و یقین تھی۔" اس موقع پر ممی نے پولی، ڈولی، کٹی، ایلما اور تھلما کے علاوہ نہایت کمسن لڑکی فی لس کو بھی بلالیا تھا۔ وسکی کا دور شروع ہوگیا۔ فی لس کے لیے ممی نے ایک ہلکا سا شروب تیار کر دیا۔ "ممی کبھی اُس سے بات کرتی کبھی اُس سے۔ کبھی سوڈا کھلواتی تھی۔ کبھی ٹوٹے ہوتے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی۔ اس کی نگاہ سب پر تھی۔ اس بلّی کی طرح جو بظاہر آنکھ بند کیے سُستاتی ہے۔ مگر اُس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارتیں کر رہے ہیں۔" ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔" اس کے پہلو میں ایک ایسا دل تھا جس میں اُن سب کے لیے ممتا تھی۔" ممی باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی۔ چڈہ نے اس کے غائبانہ میں فی لس کو وسکی کا ایک تگڑا پگ پلا دیا تھا۔ "فی لس نشے میں تھی، ہلکے ہلکے سرور میں۔" چڈہ فی لس کو اپنے ساتھ سعیدہ کاٹج لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ لیکن جب چڈہ مصر ہوا تو ممی نے "بڑے سمجھانے والے انداز" سے چڈہ سے کہا" چڈہ مائی سن (میرے بیٹے) تم کیوں نہیں سمجھتے۔ شی از ینگ (یہ کمسن ہے)، شی از ویری ینگ (یہ بہت کمسن ہے)۔" ممی کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی۔ ایک سرزنش تھی۔ ایک بڑی بھیانک تصویر تھی۔" مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ چڈہ نے

جو نشے میں بے ہوش ہو چکا تھا" فی لس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلمی ہیرو کے انداز میں اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔" ممی نے چیخ کر کہا "چڈہ چھوڑ دو۔ فور گوڈ سیک (خدا کے لیے) چھوڑ دو اسے"۔ جب چڈہ نے فی لس کو اپنے چوڑے سینے سے جُدا نہ کیا تو" ممی نے اس کے منہ پر ایک چانٹا مارا" اور چلا کر کہا "گٹ اوٹ۔ گٹ اوٹ (نکل جاؤ۔ نکل جاؤ)"۔ چڈہ ممی پر قہر آلود نگاہیں ڈالے اس کے گھر سے نکل گیا۔ فی لس کو ممی نے دوسرے ہی روز اس کے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا۔

کچھ دنوں کے بعد چڈہ خطرناک طور سے بیمار ہو گیا۔ ممی کو خبر ملی تو اس کے علاج معالجہ میں لگ گئی۔ ڈاکٹر نے چڈے کا معائنہ کیا۔ ممی چڈے کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی" وہ شفقت کا مجسمہ تھی"۔ چڈہ کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے بیٹے میرے غریب بیٹے"۔ چڈہ کو ممی نے پرائیوٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ چڈہ نے صحت یاب ہونے پر منٹو کو خط میں لکھا "عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔"

منٹو جب پھر چند دنوں کے لیے پونہ میں مقیم ہوا تو" ممی کے گھر حسب دستور محفلیں جمتی تھیں۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما، تھلما سب آتی تھیں۔ ممی وہی ممی تھی۔ پولی کی ممی، ڈولی کی ممی، چڈے کی ممی، رنجیت کمار کی ممی، سوڈے کی بوتلوں، گزک کی چیزوں، محفل جمانے کے سازو سامان کے انتظام میں وہ اسی پر شفقت انہماک سے حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اپ بھی ویسا ہی واہیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے۔ غازے اور سُرخی کی تہوں سے اُس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں"۔ ون کترے کی خوبصورت بیوی کو جب اسقاط ہوا تھا تو ممی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ ون کترے بھی فلم کمپنی میں ملازم تھا اور سعیدہ کاٹج میں رہتا تھا۔" تھلما نے جب اچانک ایک مرض خرید لیا تھا تو ممی نے اپنے بیٹوں کو ساری باتیں بتا دی تھیں اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھلما کا علاج کرائیں"۔ سعیدہ کاٹج میں ایک بنگالی میوزک ماسٹر سین کو ایک پندرہ سولہ سال کے سکھ لڑکے رام سنگھ نے قتل کر دیا تھا۔ وہ سین سے میوزک سیکھ رہا تھا اور سین اس کی مرضی کے خلاف اس سے" اپنی شہوانی خواہشات پوری کر رہا تھا"۔ تنگ آ کر رام سنگھ نے سین کو قتل کر دیا۔ ممی نے رام سنگھ سے پوری ہمدردی کی اور عدالت کے سامنے پورا واقعہ سچ سچ بتانے کا اسے مشورہ دیا۔ رام سنگھ نے

ایسا ہی کیا اور اس کی رہائی ہو گئی۔

ممی کو حکومت نے شہر بدر کر دیا۔ پولس اُس کے پیچھے لگ گئی تھی۔" اس لیے کہ پولس اس کی محبت و شفقت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی۔ وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے۔ ایک عرصے سے اس کا کیس زیر تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولس کی رپورٹ سے متفق ہو گئی۔"

موذیل۔ موذیل ایک یہودی لڑکی تھی۔ بمبئی میں ایک اسٹور میں سیلز گرل کا کام کرتی تھی جس فلیٹ میں وہ رہتی تھی اس سے متصل ایک دوسرے فلیٹ میں ترلوچن سنگھ رہتا تھا۔ یہ چار سال سے بمبئی میں مقیم تھا اور موذیل کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن موذیل اس کے ساتھ بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ سینما جاتی۔ ہوٹل میں ایک ٹیبل پر بیٹھ کر ساتھ کھانا کھاتی لیکن اگر اُس کا کوئی دوسرا ملاقاتی آ جاتا تو اس کے ٹیبل پر جا کر بیٹھ جاتی۔ موذیل ترلوچن کے سر اور داڑھی کے بال سے نفرت کرتی تھی۔ اور اس کے سکھ مذہب کا مذاق اُڑایا کرتی تھی۔ موذیل نے شرط لگا دی تھی کہ اگر ترلوچن اپنے سر اور داڑھی کے بال منڈوا دے تو وہ اس سے شادی کر لے گی۔ ترلوچن نے اس کی شرط پوری کر دی اور نہایت خوبصورت نظر آنے لگا۔ شادی طے ہو گئی لیکن جس دن شادی ہونے والی تھی موذیل ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے موٹر خریدی تھی بمبئی سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن موذیل پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا۔" لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی چیزیں پسند تھیں۔ ایک بار ترلوچن نے اُسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے۔ مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے بہت سستے آویزوں پر مرمٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔"

"ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے بڑھنے نہیں دیتی تھی۔" جب سر اور داڑھی کے بال منڈوانے پر ترلوچن نے اسے بلایا تھا تو "مائی ڈارلنگ کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ اور جب اس نے اپنی ناک پوچھنے کے لیے سکرٹ کا گھیرا اُٹھایا تھا تو ترلوچن شرما گیا تھا۔ موذیل سکرٹ کے نیچے کچھ اور نہیں پہنتی تھی۔"

موذیل نے جب ترلوچن کو دغا دی تو اس نے اپنے گاؤں کی ایک کمسن لڑکی 'کرپال کور' سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ بمبئی میں اپنے مفلوج باپ اور اندھی ماں کے ساتھ مسلمانوں کے محلے میں ایک بلڈنگ کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ جب ہندو مسلم فساد شروع ہوگیا تو ترلوچن کو ان لوگوں کو اس محلے سے نکالنے کی فکر ہونے لگی۔ وہ اسی سوچ میں تھا کہ موذیل سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ اُس نے موذیل کو بتایا کہ وہ کرپال کور سے شادی کرنے والا تھا۔ کرپال کور کو مسلمانوں کے محلے سے نکالنے کے لیے ترلوچن کی مدد کرنے کو موذیل تیار ہوگئی۔ اور ترلوچن کو ساتھ لے کر اپنی جان خطرے میں ڈال کر وہ کسی طرح اُس بلڈنگ تک پہونچی جس کے ایک فلیٹ میں کرپال کور اور اس کے ماں باپ رہتے تھے۔ بلوائیوں نے بلڈنگ پر حملہ کردیا۔ موذیل نے کرپال کور کی قمیص شلوار اُتار کر اپنا لمبا کرتا پہنا دیا اور خود ننگ دھڑنگ ہوگئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور جب بلوائی دروازہ پیٹنے لگے تو موذیل نے یکبارگی دروازہ کھول دیا اور دھڑام سے ہجوم پر گر گئی سب لوگ بوکھلا گئے۔ موذیل سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی لہولہان پتھریلی زمین پر گرتی نیچے آگئی۔ موذیل نے بلوائیوں سے یہ کہہ کر کہ ترلوچن "میاں بھائی ہے" اس کی اور کرپال کی جان بچالی۔ لیکن خود اس درجہ گھائل ہوگئی کہ جانبر نہ ہوسکی۔

منٹو کے افسانوں کے کلیدی کردار (مرد)

بابو گوپی ناتھ لاہور کے ایک بڑے کنجوس بنیے کا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی، جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق لاہور کی طوائفوں پر اڑانی شروع کر دی۔ ایک کمسن کشمیری لڑکی کو ایک نائکہ کشمیر سے بھگا کر لاہور لے آئی تھی۔ بابو گوپی ناتھ اس پر لٹو ہو گئے اور اس کو لے کر بمبئی آ گئے۔ عبدالرحمن سینڈو اور اس کی داشتہ سردار بیگم، ایک تہمد پوش غفار سائیں اور ایک لمبا تڑنگا جوان غلام علی یہ سب بابو گوپی ناتھ کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ سینڈو نے بابو گوپی ناتھ سے منٹو کی ملاقات کرا دی۔ بابو گوپی ناتھ منٹو کی بہت عزت کرنے لگے تھے۔ بابو گوپی ناتھ جانتے تھے کہ سینڈو، غلام علی اور سردار جو ان کے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی اشخاص ہیں۔ وہ ان کی گالیاں جھڑکیاں سب سنتے تھے لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ایک دن بابو گوپی ناتھ نے منٹو سے کہا "منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ نہیں لیا۔ جب بھی مجھے کوئی رائے دیتا ہے تو کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انھیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لیے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی کہ مجھ میں ایسی بیوقوفی کی شناخت کر لیا جس سے ان کا اُلو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب میری دولت ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے پر بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ بس یہی دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لیے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔" منٹو نے جب اُن سے سوال کیا کہ کیا اُنھیں گانے سے خاص دلچسپی ہے تو انھوں نے جواب دیا "بالکل نہیں لیکن جیب سے دس روپیہ نکال کر گانے والی کو دکھانے

میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اُسے لینے کے لیے ادائے آگئی۔ پاس آئی تو نوٹ جیب میں اڑس لیا۔ اُس نے جھک کر اُسے باہر نکالا۔ تو ہم خوش ہوگئے۔ ایسی بہت سی فضول باتیں ہم تماشہ بینوں کو پسند ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اولاد سے پیشہ کراتے ہیں۔"

بابو گوپی ناتھ زینت سے بڑے خلوص کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ اس کی نیک اور بے لوث طبیعت سے وہ بہت متاثر تھے۔ اُنھیں فکر تھی کہ اس کی کسی اچھے شخص سے شادی کراکے اُس کی زندگی سنوار دیں۔ لیکن جس جس شخص کا اُنھوں نے زینت کے ساتھ نباہ کرنے کے لیے انتخاب کیا وہ سب کے سب اپنے مطلب کے نکلے۔ آخر انھوں نے حیدر آباد کے ایک خوبصورت رئیس زادے سے زینت کی بات پکی کرلی اور بڑے خلوص اور بڑی سرگرمی کے ساتھ اُس کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کا زیور دو ہزار کے کپڑے بنوائے اور پانچ ہزار نقد دیا۔ منٹو نے زینت کو دلہن بنے دیکھا تو بے اختیار ہنسی آگئی اور زینت سے کہا" یہ کیا مسخرہ پن ہے۔" زینت نے منٹو کی طرف "معصوم کبوتری کی طرح دیکھا" اور کہا" آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان"۔ منٹو کی اس بات سے بابو گوپی ناتھ کو بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے زینت کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا" خدا تمھیں خوش رکھے۔" انھوں نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے منٹو کی طرف دیکھا۔" ان میں ملامت تھی۔ بہت ہی دکھ بھری ملامت۔"

سہائے:۔ سہائے بمبئی میں عورتوں کی دلالی کرتا تھا۔ وہ بنارس کا رہنے والا تھا۔ وہ بہت ہی صفائی پسند تھا۔ اس کے کمرے میں ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوتی۔ تکیہ کا سفید غلاف اور پلنگ کی سفید چادر ہر وقت صاف ستھری رہتی۔ نوکر موجود تھا لیکن ہر چیز کی صفائی وہ اپنے ہاتھ سے کرتا اور اپنے دوسرے کام بھی زیادہ تر خود کر لیا کرتا۔ وہ کسی کے ساتھ دھوکہ فریب نہیں کرتا تھا" رات زیادہ گذر گئی ہے۔ اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو صاف کہہ دیتا ہے کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجئے۔ اگر کسی لڑکی کے متعلق اُسے شک ہے تو چھپاتا نہیں تھا۔" تین سال کے اندر سہائے اپنے دھندے سے بیس ہزار روپے جمع کر چکا تھا۔ اور تیس ہزار پورا ہو جانے کے بعد اس پیشے سے علیحدہ ہو کر بنارس واپس جانے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔" وہ وہاں بزازی کی دکان کھولے گا۔" اُن تمام لڑکیوں کو جو اس کے ساتھ پیشے میں کام کرتی تھیں اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی قید نہ تھی۔ اُس نے ہر لڑکی کے نام سے پوسٹ آفس سیونگ

بنک میں اکونٹ کھول دیا تھا۔ اور ان کی کمائی کا پیسہ ہر ماہ بنک میں جمع کر دیتا تھا۔

ممتاز جب کا سہائے سے ملنا جلنا تھا اُپنے دو ہندو دوستوں کو سہائے کی داستان سنا رہا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے۔ ممتاز انھیں دنوں بھنڈی بازار سے گذر رہا تھا۔ اس نے سہائے کو سڑک پر تقریباً مردہ پایا۔ ممتاز اُسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ سہائے کے کپڑے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ اس کا سارا بدن زخمی ہو رہا تھا۔ مسلمان بلوائیوں نے اس پر حملہ کر دیا تھا اور اُسے مردہ سمجھ کر اُسے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ سہائے نے آنکھیں کھولیں اور ممتاز کو پہچان کر کہا "آپ ؟........آپ ؟" ممتاز نے اُسے اُس حالت میں دیکھ کر بہت سارے سوالات کر ڈالے۔ لیکن اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے قمیض کے بٹن کھولے اور ممتاز سے کہا "نیچے بنڈی ہے۔ ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں۔ یہ یہ ..... سلطانہ کا مال ہے۔ میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا۔ آج اُسے بھیجنے والا تھا۔ آپ اُسے دے دیجئے گا۔ اور کہئے گا کہ فوراً چلی جائے۔ اور آپ اپنا خیال رکھئے گا۔" ممتاز سلطانہ سے ملا۔ وہ روپے اور زیور اس نے سلطانہ کو دے دیا۔ "اس کو روپیہ اور زیور دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

ممد بھائی :۔ یہ عرب گلی کا ایک مشہور دادا تھا۔ اس کی گھنی خوفناک مونچھ سے لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ وہ ایک مانا ہوا غنڈہ تھا۔ چھری ماری میں بمبئی بھر میں اُس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لوگوں نے اس کے متعلق مشہور کر رکھا تھا کہ وہ سیکڑوں قتل کر چکا ہے۔ اس پاس کا رہنے والا کوئی مرد یا عورت ایسی نہ تھی جس کے وقت پر ممد بھائی کام نہ آیا ہو۔ اس کے شاگرد سارے محلے کے لوگوں کی خبر اس کے پاس پہنچاتے رہتے۔ وہ ہر ایک کی ضرورت پوری کرتا رہتا۔ اگر کوئی ضرورت مند مقروض ہو جاتا تو اس کی خبر بھی ممد بھائی کو لگ جاتی اور وہ اپنی جیب سے اس کے پیسے پیسے کا حساب چکا دیتا۔ اگر کوئی بیمار پڑ جاتا اور ممد بھائی کے کارندے اس کی خبر ممد بھائی کو پہنچا دیتے تو وہ ڈاکٹر کو لے کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ کسی ڈاکٹر کی مجال نہ تھی کہ ممد بھائی کی عدول حکمی کر سکتا۔ یا کسی سے ممد بھائی کی موجودگی میں فیس لے سکتا۔ ممد بھائی عورتوں کے معاملے میں نہایت پاکباز تھا۔ "اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔" وہ لنگوٹ بند تھا۔ کسی عورت سے اس کا جنسی تعلق نہیں رہا تھا۔ محلے کی ایک عورت کی لڑکی کو کسی نے خراب کر دیا تھا۔ وہ عورت ممد بھائی کے پاس فریاد لے کر آئی۔ اور اس سے التجا کی کہ ممد بھائی "اس حرام زادے کا پیٹ چاک کر دیجئے۔" ممد بھائی نے حامی

بھرلی۔ اس شخص کا پیٹ چاک کر کے مقدمے میں پھنس گیا۔ چوں کہ اس کے ہاتھ سے قتل کا کوئی ثبوت نہیں تھا، مجسٹریٹ نے محمد بھائی کو خطرناک غنڈہ قرار دے کر شہر بدر کر دیا۔

وددا پہلوان:۔ وددا پہلوان رنڈیوں کے کوٹھے پر جاتا، گانا سنتا، شراب پیتا، طوائفوں سے فحش مذاق بھی کرتا تھا مگر اس سے آگے کبھی بھی نہیں گیا تھا۔ اسے اپنے لنگوٹ بند ہونے پر ناز تھا۔ وددا صلاحو کو بہت مانتا تھا۔ صلاحو ایک عیاش طبع خوبصورت نوجوان تھا۔ اپنے باپ کی کمائی ہوئی دولت بیدردی سے رنڈیوں کے پیچھے تباہ کر رہا تھا۔ وددا نہایت ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ صلاحو کی خوشی میں شریک رہتا تھا۔ صلاحو اپنے روپے وددا کی تحویل میں رکھتا لیکن کیا مجال کے وددا اس میں سے ایک پائی بھی ادھر سے اُدھر کر دے۔ صلاحو رنڈیوں کے پیچھے اپنی ساری دولت گنوا چکا تھا کہ کشمیر سے ایک طوائف الماس آئی جو رنڈیوں کا مشہور بازار ہیرا منڈی پر چھا گئی۔ صلاحو اس کی نتھنی اتارنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اس کے لیے الماس کی ماں اقبال کا پچیس ہزار کا مطالبہ تھا۔ صلاحو نے دو مکان بیچ دیئے۔ اور پچیس ہزار روپے لے کر اقبال کے پاس پہنچا۔ ماں بیٹی نتھنی کے معاملے کو ٹالتی رہیں۔ اور صلاحو کے ساتھ سیر سپاٹے میں سارے روپے خرچ کر دیئے۔ آخر میں صلاحو نے اپنا رہائشی مکان جس میں اس کی نیک سیرت ماں رہتی تھی گروی کر کے دس ہزار روپے قرض لیے۔ لیکن وہ روپے بھی الماس کے نظر ہو گئے۔ مکان کی قرقی ہو گئی۔ وددا نے اپنے ذاتی اثر سے اس وعدے پر کہ روپیہ کا انتظام کر کے ادا کر دے گا مکان کو نیلام ہونے سے رکوا دیا۔ وہ دس ہزار روپے لے کر صلاحو کے پاس پہنچا۔ صلاحو قرقی کو بھول کر روپے لے کر الماس کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ وددا نے یہ کہہ کر صلاحو کو روک دیا کہ "اب اسے الماس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" وددا کو یہ روپے الماس ہی نے دیئے تھے۔ صلاحو کے مکان کو نیلام سے بچانے کے لیے وددا نے بڑی قربانی کی تھی۔ الماس وددا پر مرتی تھی۔ لیکن وددا کی لنگوٹ بندی حائل تھی۔ وددا کو اپنی بہادری، اپنی ایمانداری اور اپنے خلوص پر فخر نہیں تھا۔ لیکن اسے اپنے لنگوٹ بند ہونے پر ناز تھا۔ صلاحو کی خاطر وددا کو الماس سے اپنی لنگوٹ بندی کا سودا کرنا پڑا۔" صلاحو کو یہ بات بتا کر وددا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔"

رام سروپ:۔ رام سروپ افسانہ " خالی ڈبے خالی بوتلوں" کا مرکزی کردار ہے۔

وہ فلمی دنیا کا ایک منجھا ہوا ایکٹر تھا۔ فلمی دنیا میں رہ کر بھی اس کی زندگی جنسی آلائشوں سے پاک تھی۔ بمبئی آنے کے آٹھ سال بعد منٹو اس سے پہلی بار ملا تھا۔ اور بعد میں منٹو کی رام سروپ سے دوستی ہو گئی تھی۔ اور وہ اکثر اس کے یہاں جایا کرتا تھا۔

رام سروپ نے شیواجی پارک میں سمندر کے کنارے ایک متوسط درجے کا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اس میں چار کمرے تھے۔ اس فلیٹ میں جو کنبہ رہتا تھا اس کے آٹھ افراد تھے۔ خود رام سروپ اور اس کا نوکر، جو باورچی کا کام بھی کرتا تھا تین کتے، ایک بندر، ایک بندریا اور ایک بلی۔ ان نصف درجن جانوروں سے رام سروپ کو والہانہ محبت تھی۔ اور اپنے خالی وقتوں میں وہ ان کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ نوکر کو ہدایت تھی کہ رم کی بوتل یا سگریٹ کا ڈبہ جب خالی ہو گا تو اُسے بیچا یا پھینکا نہیں جائے گا۔ اسے احتیاط سے کمرے میں رکھ دیا جائے گا۔ خالی بوتلوں اور خالی ڈبوں کے انبار لگے تھے۔ یہ ذخیرہ دس سال سے جمع ہو رہا تھا جب رام سروپ شیواجی پارک میں آیا تھا تو وہ تمام ڈبے اور بوتلیں اپنے ساتھ اُٹھوا کر اپنے ساتھ لے آیا تھا جو اس کے پرانے مکان میں جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی ڈبہ یا بوتل اِدھر سے اُدھر ہو جاتی تو وہ نوکر پر قیامت برپا کر دیتا تھا۔

رام سروپ کو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر کوئی ایکٹرس اُس سے ملنے آتی تو نوکر کو ہدایت تھی کہ اُسے دروازے پر سے ہی یہ کہہ کر واپس کر دے کہ "رات صاحب کی شوٹنگ تھی ابھی سوئے ہوئے ہیں۔" ملاقات کرنے والی شام کو یا رات کو آتی تو اُس سے کہہ دیا جاتا کہ "صاحب شوٹنگ پر گئے ہیں۔"

منٹو سے رام سروپ کی کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ منٹو جب کبھی اُس سے پوچھتا کہ شادی کب کرو گے تو وہ ایک سا جواب دیتا "شادی کر کے کیا کروں گا؟" منٹو نے کئی مرتبہ اُڑتی پڑتی خبر سنی تھی کہ رام سروپ کو ایک ایکٹرس سے جس کا نام شیلا تھا عشق ہو گیا ہے۔ منٹو کو اس کا بالکل یقین نہ آیا۔" اول تو رام سروپ سے اس کی توقع ہی نہ تھی۔ دوسرے شیلا سے کسی ہوشمند جوان کو عشق نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس قدر بے حس تھی کہ دل کی مریض معلوم ہوتی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ ایک دو فلموں میں آئی تھی تو کسی قدر گوارا تھی۔ لیکن بعد میں تو وہ بالکل ہی بے رنگ و بے کیف ہو گئی تھی۔ اور صرف تیسرے درجوں کے فلموں کے

لیے مخصوص تھی۔" منٹو نے ایک بار شیلا کے بارے میں رام سروپ سے دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر کہا "میرے لیے کیا یہ ہی رہ گئی تھی۔"

اس دوران میں رام سروپ کا پیارا کتا اسٹالین نمونیا میں گرفتار ہوگیا۔ رام سروپ نے دن رات بڑی جاں فشانی سے اس کا علاج کیا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اس کی موت سے رام سروپ کو بہت صدمہ ہوا۔ "کتنے دن اس کی آنکھیں اشک آلود رہیں۔" ایک روز اس نے باقی کتے کسی دوست کو دے دیئے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد بندر اور بندریا کو بھی رخصت کر دیا۔

رام سروپ کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ ایک روز منٹو اُدھر سے گذر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نیچے گراج کے پاس خالی ڈبوں اور بوتلوں کے انبار کے انبار پڑے ہیں۔ سڑک پر تین چار کباڑیئے انھیں دو چھکڑوں میں لاد رہے ہیں۔ منٹو کو یہ منظر دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ "یقین مانئے اس کو جدا ہوتے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں ایک عجیب قسم کا درد محسوس کیا۔" اس روز شام کو رام سروپ منٹو کے گھر گیا۔ اس کے ساتھ شیلا بھی تھی۔ "نئی بنارسی ساری میں ملبوس۔" رام سروپ نے منٹو سے کہا: "میری دھرم پتنی ہے۔" منٹو کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا۔ "اگر میں نے وہسکی کے چار پگ نہ پئے ہوتے تو یقیناً یہ سن کر بے ہوش ہوگیا ہوتا۔" رام سروپ کے جانے کے بعد منٹو دیر تک سوچتا رہا کہ بنارسی ساری میں شیلا کس کے مشابہ تھی؟ "دبلے بدن پر ہلکی بادامی رنگ کی ساڑی۔ کسی جگہ پھولی ہوئی۔ کسی جگہ دبی ہوئی۔ ایک دم میری آنکھوں کے سامنے ایک خالی بوتل آگئی۔ باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی۔"

جاوید: جاوید منٹو کا افسانہ 'ڈرپوک' کا کردار ہے۔ جاوید کے دل میں عورت کی قربت حاصل کرنے کی خواہش ایک عرصہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی عمر ستائیس سال کی ہوچکی تھی۔ لیکن وہ اب تک کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ اُسے اب یقین آگیا تھا کہ عورت کا جو تصور اُس نے قایم کر لیا تھا ویسی "سالم عورت" اس کی زندگی میں کبھی نہ آئے گی۔ وہ پہلے انسان کے بارے میں بھی بہت اونچا خیال رکھتا تھا۔ "لیکن اب انسانوں سے اُسے نفرت تھی۔ اس قدر کہ اپنے آپ سے بھی وہ متنفر ہوچکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس طور پر کہ ایک عرصہ تک اُس کے خوبصورت خیال جن کو اُس نے اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجائے رکھا تھا غلاظت سے لتھڑائے رہیں۔"

جاوید عورت کی تلاش میں گھر سے نکل کر اس قحبہ خانے کے قریب پہنچ گیا تھا جس کا پتہ اُس کے اُس دوست نے بتایا تھا" جو حسن و عشق کی لاش کئی مرتبہ اس قبرستان میں دفن کر چکا تھا" وہ جاوید سے کہا کرتا تھا" تم عورت عورت پکارا کرتے ہو.......عورت ہے کہاں ؟..... مجھے تو اپنی زندگی میں ایک عورت نظر آئی جو میری ماں تھی۔ مستورات البتہ دیکھی ہیں۔ اور اُن کے متعلق سنا بھی ہے۔ لیکن جب کبھی عورت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے میں نے مائی جیوان کے کوٹھے کو اپنا بہترین رفیق پایا ہے..... بخدا مائی جیوان عورت نہیں فرشتہ ہے..... خدا اُس کو خضر کی عمر عطا کرے۔" جاوید اپنے دل میں سوچ رہا تھا" مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی ہے۔ لیکن غلاظت تو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔اب جی یہ چاہتا ہے کہ اپنی روح اور اپنے جسم کے ہر ذرے کو اس غلاظت سے آلودہ کر دوں۔ میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے اب بدبو اور متعفن چیزیں سونگھنے کے لیے بیتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پرانے خیالات کا چوغہ اتار کر اس محلے کا رخ کیا ہے۔ جہاں ہر شے ایک پراسرار تعفن میں لپٹی نظر آتی ہے۔ یہ دنیا کس قدر بھیانک طور پر حسین ہے!" اُسے میونسپلٹی کی لالٹین اس کی طرف گھورتی محسوس ہوئی۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ سہما سا گیا۔"یہ لالٹین مجھے کیوں گھور رہی ہے ؟ میرے راستوں میں کیوں روڑے اٹکاتی ہے ؟" اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی زندگی کے ستائیس برسوں کی جھجک جو اسے ورثے میں ملی تھی اس لالٹین میں جمع ہو گئی ہے۔ یہ" جھجک جس کو پرانی کیچلی کی طرح وہ اتار کر گھر چھوڑ آیا تھا اُس سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ جہاں اُسے اپنی زندگی کا سب سے بھدا کھیل کھیلنا تھا۔ ایسا کھیل جو اسے کیچڑ میں لت پت کر دے، اُس کی روح کو ملوث کر دے۔"

مائی جیوان کے مکان میں چار پانچ پیشہ کرانے والی عورتیں رہتی تھیں جو رات کے اندھیرے میں اور دن کے اُجالے میں یکساں بھدے پن سے پیشہ کراتی تھیں۔" یہ عورتیں گندی موری سے غلاظت نکالنے والے پمپ کی طرح دن رات چلتی رہتی تھیں۔" جاوید ان سب کے بارے میں سن چکا تھا۔ ان چار پانچ عورتوں میں سے جاوید کی کسی خاص پر نظر نہیں تھی۔" مجھے کوئی بھی مل جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے دام لیے جائیں۔ اور کھٹ سے ایک عورت میری بغل میں تھما دی جائے۔ ایک سکنڈ کی دیر نہ ہونی چاہیے۔ کسی قسم کی گفتگو نہ ہو۔ کوئی نرم و

نازک فقرہ منہ سے نہ نکلنے پائے۔ قدموں کی چاپ سنائی دے۔ دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو۔ روپے کھن کھنائیں اور آوازیں بھی آئیں۔ مگر منہ بند رہے۔ اگر آواز نکلے تو وہ انسانی آواز نہ معلوم ہو۔ ملاقات ہو بالکل حیوانوں کی طرح۔ تہذیب و تمدن کے صندوق میں تالا لگ جائے۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسی دنیا آباد ہو جائے جس میں سونگھنے، دیکھنے اور سننے کی نازک حسیات، زنگ لگے استرے کے مانند کند ہو جائیں۔"

"جاوید بے چین ہو گیا۔ ایک الجھن سی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی۔ ارادہ اس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ اگر پہاڑ بھی اس کے راستے میں ہوتے تو وہ ان سے بھڑ جاتا۔ مگر میونسپل کمیٹی کی ایک اندھی لالٹین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بجھا سکتا تھا۔ اس کی راہ میں پوری طرح حائل ہو گئی تھی۔" وہ سوچنے لگا "میں ڈرتا ہوں۔ میں ڈرپوک ہوں ...... میں ڈرپوک ہوں .... لعنت ہو مجھ پر"۔ اس نے کتنی لعنتیں اپنے اوپر بھیجیں مگر خاطر خواہ اثر نہ پیدا ہوا۔ اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔"

مائی جیواں کے قحبہ خانے کے قریب جاوید نے ایک کوٹھے پر ایک سیاہ فام عورت کو دیکھا جو بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ تین شرابی اس سیاہ فام عورت کے کوٹھے کے نیچے پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ اور جاوید کے کانوں نے ایسی واہیات باتیں سنیں کہ اس کے تمام ارادے اس کے اندر سمٹ گئے۔ ان میں سے ایک شرابی نے اس سیاہ فام عورت پر ایک فقرہ چست کیا جس کا جواب اس نے یوں دیا جیسے "ٹوکری بھر کوڑا پھینک دیا ہو۔" وہ تینوں اس کے کوٹھے پر چڑھ گئے۔

جاوید اپنے آپ سے اور زیادہ متنفر ہو گیا۔ "تم ... تم ... تم کیا ہو؟ ... میں پوچھتا ہوں آخر تم ہو کیا؟ ... نہ تم یہ ہو نہ تم وہ ہو .... نہ تم انسان ہو نہ حیوان ... تمہاری ذہانت، ذکاوت آج سب دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ تین شرابی آتے ہیں۔ تمہاری طرح ان کے دل میں ارادہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ بے دھڑک اس ویشیا سے واہیات باتیں کرتے ہیں اور ہنستے، قہقہے لگاتے کوٹھے پر چڑھ جاتے ہیں۔ گویا پتنگ اڑانے جا رہے ہیں۔ ... اور تم .... اور تم جو کہ اچھی طرح سمجھتے ہو کہ تمھیں کیا کرنا ہے یوں بیوقوفوں کی طرح بیچ بازار میں کھڑے ہو۔ اور ایک بے جان لالٹین سے خوف کھا رہے ہو؟ ... تمہارا ارادہ اس قدر صاف و شفاف ہے لیکن پھر بھی تمہارے قدم آگے نہیں بڑھتے ... لعنت ہو تم پر۔"

اس دوران میں اس نے لالٹین کی طرف دیکھا تو وہ اُسے یہ کہتی ہوئی معلوم ہوئی۔" تم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگے۔ اس لیے کہ تم ڈرپوک ہو... یاد ہے تمھیں! پچھلے برسوں برسات میں جب تم نے اس ہندو لڑکی اندرا سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہا تھا تو تمھارے جسم میں سکت نہیں رہی تھی۔ کیسے کیسے بھیانک خیال تمھارے دل میں پیدا ہوتے تھے.... یاد ہے تم نے ہندو مسلم فساد کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ اور تم ڈر گئے تھے۔ اس لڑکی کو تم نے اُسی ڈر کے مارے بھلا دیا۔ اور حمیدہ سے تم اس لیے محبت نہ کر سکے کہ وہ تمھاری رشتہ دار تھی۔ اور تمھیں اس بات کا خوف تھا کہ تمھاری محبت کو غلط نظروں سے دیکھا جائے گا۔ کیسے کیسے وہم تمھارے اوپر ان دنوں مسلط تھے۔ اور پھر... اور پھر تم نے بلقیس سے محبت کرنی چاہی مگر اس کو صرف ایک بار دیکھ کر تمھارے سب ارادے غائب ہو گئے.... اور تمھارا دل ویسے کا ویسے بنجر رہا... کیا تمھیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہر بار تم نے اپنی بے لوث محبت کو آپ ہی شک کی نظروں دیکھا ہے... تمھیں اس بات کا پوری طرح یقین نہیں آیا کہ تمھاری محبت ٹھیک فطری حالت میں ہے... تم ہمیشہ ڈرتے رہے۔"

" جاوید کی رہی سہی ہمت بھی پست ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ واقعی پرلے درجے کا ڈرپوک ہے۔ بیتے ہوئے واقعات تیز ہوا میں رکھی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح اُس کے دماغ میں پھڑپھڑاتے رہے۔ اور پہلی مرتبہ اس کو اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اس کے وجود کی بنیادوں میں ایک جھجک بیٹھی ہوئی ہے۔ جس نے اُسے قابل رحم حد تک ڈرپوک بنا دیا ہے۔"

سامنے سیڑھیوں سے کسی کے اُترنے کی آواز آئی تو جاوید اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ مائی جیواں کے کوٹھے سے ایک عورت نے اس کو آواز دی "میری جان گھبراؤ نہیں... آؤ.... آؤ۔" اس کے بعد اس نے "پچکارتے ہوئے کہا" چلے آؤ۔ چلے آؤ۔" یہ سن کر جاوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا تو اس کی پیٹھ پر دُم اُگ آئے گی جو اس ویشیا کے پچکارنے پر ہلنا شروع کر دے گی۔" مائی جیوا کے قحبہ خانے سے "اس عینک چڑھی لونڈیا نے اس طور پر اپنے اپنے باوزن جسم کو حرکت دی کہ جاوید کے تمام ارادے پکے ہوئے بیروں کے مانند جھڑ گئے۔" اس نے پھر پچکارا " آؤ... میری جان اب بھی آجاؤ۔"

جاوید اُٹھ کر بھاگا۔ موری پھاند کر جب وہ بازار میں پہنچا تو اس نے ایک ایسے قہقہے کی آواز سنی جو خطرناک طور پر بھیانک تھا۔ وہ کانپ اُٹھا۔

جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو اس کے خیالات کے ہجوم میں سے دفعتاً ایک خیال رینگ کر آگے بڑھا اور اس کو تسکین دی ،، جاوید تم ایک بہت بڑے گناہ سے بچ گئے ہو۔ خدا کا شکر بجالاؤ۔''

رندھیر :۔ افسانہ 'بو' کا کردار ہے۔ رندھیر ایک تعلیم یافتہ خوبصورت نوجوان تھا۔ شادی سے پہلے وہ کتنی لڑکیوں کے ساتھ جسمانی تعلق کی لذتوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ رندھیر بالکنی میں کھڑا تھا۔ سامنے املی کے پیڑ کے نیچے ایک گھاٹن لڑکی اُسے نظر آئی۔ وہ پاس ہی رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی۔ رندھیر نے اُسے اشارے سے اوپر بلایا۔ اور اپنی دھوتی اُسے دی تاکہ وہ اپنا گیلا لہنگا اور چولی اُتار کر الگ کر دے۔ رندھیر نے اس کی چولی کی گرہ کھولنے میں اس کی مدد کی جس سے لڑکی کی چھاتیاں یکبارگی نمایاں ہو گئیں۔ رندھیر اس کے ساتھ چمٹ گیا۔

یہ گھاٹن لڑکی رندھیر کو ان لڑکیوں سے بالکل مختلف نظر آئی جن کے ساتھ وہ پہلے جسمانی طور پر لطف اندوز ہو چکا تھا۔ "ساری رات رندھیر کو اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بو آتی رہی تھی۔ اُس بو کو جو بہ یک وقت خوشبو بھی تھی اور بدبو بھی ... وہ ساری رات پیتا رہا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، اس کے جسم کے ہر حصّے سے یہ بو جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی۔ رندھیر کے پورے سراپا میں بس گئی تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز اتنی قریب نہ ہوتی اگر اس کے جسم سے یہ بو نہ اڑتی۔ یہ اس کے دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ رہی تھی۔ اس کے تمام نئے پرانے احساسات میں رچ گئی تھی۔"

"اس بو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ رندھیر بخوبی سمجھتا تھا۔ لیکن سمجھتے ہوئے بھی وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح کبھی مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی بو نکلتی ہے۔ لیکن نہیں وہ بو کچھ اور ہی طرح کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کی آمیزش نہیں تھی۔ وہ بالکل اصلی تھی۔ عورت اور مرد کے جسمانی تعلقات کی طرح اصلی اور مقدس۔"

"رندھیر کو پسینے کی بو سے نفرت تھی۔ نہانے کے بعد وہ ہمیشہ بغلوں وغیرہ میں پاؤڈر چھڑکتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے وہ بدبو جاتی رہے۔ لیکن تعجب ہے اس نے کئی بار، ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں سے بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہیں آئی۔ بلکہ عجیب قسم کی تسکین کا احساس ہوا۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے۔ پہچانتا ہے۔ اس کے معنی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا۔"

اس کے ایک سال بعد رندھیر ایسی ہی برسات کی رات میں اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ ہم بستر تھا۔ یہ ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی بیٹی تھی۔ اس نے بی۔اے۔ تک تعلیم حاصل کی تھی۔ "ایک گوری چٹی لڑکی اپنے عریاں جسم کو چادر میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے قریب قریب سو گئی تھی۔ اس کی سرخ ریشمی شلوار ایک دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سرخ رنگ کے آزاربند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ پلنگ پر اس کے دوسرے اتارے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ سنہری پھولدار جمپر، انگیا، جانگیا اور دوپٹہ سب کا رنگ سرخ تھا۔ گہرا سرخ اور ان سب میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔"

"لڑکی کے سیاہ بالوں میں مکیش کے ذرّے دھول کے ذروں کی طرح چھپے ہوئے تھے۔ چہرے پر پاؤڈر کی سرخی اور مکیش کے ان ذروں نے مل کر ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ بے نام سا اڑا اڑا رنگ اور اس کے گورے سینے پر کچے رنگ کی انگیا نے جگہ جگہ سرخ دھبے بنا دیئے تھے۔" "چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں۔ ان میں ہلکا ہلکا نیلا پن تھا۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہاں سرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔"

"رندھیر کے بدن کے ہر رونگٹے نے اس لڑکی کے بدن کے چھیڑے ہوئے تاروں کی آواز سنی تھی۔ مگر وہ آواز کہاں تھی؟ وہ پکار جو اس گھاٹن لڑکی کے بدن میں سونگھی تھی۔ وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے زیادہ مسرور کن ہوتی ہے۔ وہ پکار جو حلقۂ خواب سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔"

اس گوری چٹی لڑکی کے نیند سے ماتے بدن سے جو "حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی جواب تھکی تھکی سی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی، جنون کی حد تک پہنچی ہوئی یہ خوشبو بہت بری معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جیسی بدہضمی کی

ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداس، بے رنگ، بے چین۔"

"رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بلا کسی بیرونی کوشش کے از خود نکل رہی تھی۔ وہ بو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور رس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جس میں سونگھے جانے کی کوشش نہیں تھی۔ وہ خود بہ خود ناک کے رستے اندر گھس کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ جاتی تھی۔"

"وہ حنا کی خوشبو میں اس کی تلاش کر رہا تھا جو . . . اس گھاٹن لڑکی کے بدن سے آتی تھی۔"

منٹو کی شخصیت کا تضاد اور بے ربطی

سطور بالا کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو منٹو کی شخصیت اور کردار میں حیرت انگیز تضاد، بے ربطی اور کچھ دوسری عجیب و غریب باتوں کا انکشاف ہوگا۔ منٹو ایک بلانوش تھا۔ لیکن بنت عنب کے شیدائیوں کے اندر جو دوسری علتیں لازمی طور پر پائی جاتی ہیں، منٹو ان سے قطعی عاری تھا۔ اس کا صاف ستھرا لباس، گھر میں چیزوں کو قرینے سے رکھنے کا ڈھنگ، کوڑا کرکٹ، گندگی اور غلاظت سے تنفر یہ ساری باتیں اس کی حد سے زیادہ شراب پینے کی لت کے تناظر میں کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہیں۔ اُن دنوں بھی جب وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں زبوں حالی اور ساتھ ہی کثرت مے نوشی کا شکار تھا اس کی نفاست پسندی اور ستھراپن میں سر مو فرق نہ آیا تھا۔ ایسی کثرت شراب نوشی کے باوجود اس پر کبھی بھی بدمستی نہیں طاری ہوئی تھی۔ اس سے کبھی بھی نشے کی حالت میں کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جس سے عورتوں کے معاملے میں اس کی پاک بازی پر حرف آ سکتا۔ اس کی شراب نوشی خانگی زندگی کی فرض شناسیوں اور ذمہ داریوں، فکر معاش کی تگ و دو میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ شراب پی کر بھی اس نے کبھی اپنے ہوش و حواس کھو نہیں دیے۔ پارو دیوی کے یہاں ہولی کے موقع پر محفل نشاط میں وہ وہسکی کے پگ کے پگ حلق کے نیچے اتار چکا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے ہوش و حواس ویسے ہی مجتمع رہے۔ مذہب کا احترام اس کے دل و دماغ میں اسی طرح جاگزیں رہا۔ پارو دیوی نے جب اپنی نغمہ سرائی کے اختتام پر اس کی خاطر نعت سرائی شروع کی تو منٹو نے اُسے فوراً روک دیا۔ اُس محفل عیش و طرب میں کملی والے کا ذکر اُسے اچھا نہیں لگا۔

ایک طرف منٹو اپنے رند خراباتی ہونے کا ڈنکا پیٹنے سے باز نہیں آتا تھا تو دوسری

طرف اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے" لوگ اپنے آپ کو مدہوش کیوں کرتے ہیں" منٹو ہر مدہوش کرنے والی شے کو جس میں وہ شراب کو بھی شامل کرتا ہے "انسانیت کے لیے ایک لعنت سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں لوگ منشیات کا استعمال اپنے ضمیر کو کند کرنے کے لیے کرتے ہیں۔" لوگ ان اشیا کو یا تو اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ شرم کے ان احساسات کو دبا دیں جو کسی غلط کام کرنے پر پیدا ہوتے ہیں۔ یا پہلے سے خود پر ایسی حالت طاری کر لیں جس میں وہ ضمیر کے خلاف کام کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے حیوانی وجود کی اطاعت کریں۔" منٹو اپنے اس خیال کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے" ہوش کی حالت میں مرد ویشیا کے مکان جانے سے ڈرتا ہے۔ چوری کرنے سے خوف کھاتا ہے اور کسی کو قتل کرنے کی جرات نہیں کرتا۔ لیکن یہ تمام کام کرتے ہوئے شرابی کو کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی آدمی اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنا چاہے تو اسے خود کو مدہوش کرنا پڑتا ہے"۔ (منٹو کے ادبی مضامین)۔ شراب کے متعلق اپنے ان تاثرات کو منٹو نے اپنے ایک افسانے میں بھی پیش کیا ہے۔ اصغر علی ایک نہایت کامیاب فوٹو گرافر ہے۔" تندرست، جوان اور خوبصورت لڑکیوں اور عورتوں کی تصویریں اتارتے وقت اصغر علی کی آنکھوں میں حیوانیت کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آتی تھی۔" لیکن وہ ہی اصغر علی جب شراب کے نشے میں ہوتا" تو وہ انسان کم اور حیوان زیادہ ہوتا ہے۔" اصغر علی کے لیے شراب ایک تیز گاڑی تھی جو اُسے فوراً برائی کی طرف کھینچ کر لے جاتی تھی۔" (اصغر علی فوٹو گرافر) اس کہانی میں اصغر علی شراب کے نشے میں ہوش کھو کر ایک کمسن بیوہ لڑکی شاردا کے ساتھ دست درازی کرتا ہے جس سے اس کے بیوگی کے پیدا کیے ہوئے سارے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ اشک آلود نگاہیں منٹو پر ڈال کر کہتی ہے" آپ کے دوست نے دھوا سمجھ کر ہی ہاتھ ڈالا تھا۔ سوچا ہو گا اس عورت کا کون ہے"۔ اپنا مضمون، لوگ اپنے کو مدہوش کیوں کرتے ہیں، منٹو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔" انسانیت کی تاریخ میں وہ دن قابل یادگار ہو گا جب اس خطرناک برائی سے نجات حاصل کی جائے گی۔ اور وہ دن بہت دور نہیں اس لیے کہ اس برائی کے نتائج سے لوگ اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہیں . . . . اب وہ دن بہت نزدیک ہے جب یہ بیداری لوگوں کو مدہوش بنانے والی چیزوں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دے گی۔ اور ان کی آنکھیں کھول دے گی تاکہ وہ اپنے ضمیر کے مطالبات دیکھ سکیں اور ان پر غور کر سکیں" (منٹو کے ادبی مضامین) کون یقین کرے گا کہ یہ تحریر منٹو بلا نوش کی ہے جو موقع بے موقع پکار

پکار کر اپنی کثرت مے نوشی کا اعلان کرتا ہے۔

جس ماحول میں منٹو نے اپنی جوانی کے دن گذارے اور جن لوگوں سے اس کے دوستانہ تعلقات رہے ان میں سوائے اشوک کمار کے سارے کے سارے شہوت رانی اور جنسی بے عنانی کے شکار تھے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر شادی شدہ تھے۔ لیکن ان کی ہوسناکی کے لیے گھر کی چار دیواری کی قید بھاری تھی۔ اس سے آزاد ہونے کے لیے وہ کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ ایسے اشتعال انگیز ماحول میں منٹو کی ازدواجی زندگی جیسی شریفانہ اور بے داغ تھی اس کی مثال نہیں ملتی منٹو کے بیان کے مطابق اشوک کمار کی ازدواجی زندگی بھی ویسی ہی بے داغ تھی لیکن اشوک کے اندر بھی کبھی کبھی ہوس کی چنگاری جاگ اٹھتی تھی لیکن اس کا شرمیلا پن کسی مثبت اقدام سے اسے روک دیتا تھا (اشوک کمار) منٹو کے اندر ایسی ترغیب کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ یہ جان کر کہ چار سال تک ایسے شہوت خیز ماحول میں مجردانہ زندگی گذار کر منٹو ہر طرح کی جنسی آلودگی سے پاک رہا۔ اس کی پاکبازی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

عورت کی عریانی کا منظر منٹو کی آنکھوں میں کھٹکنے لگتا ہے وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ نورجہاں کی کھڑکیوں والی جالی دار شلوار اور قمیض کی طرف سے اپنی "زخمی نگاہیں" ہٹا کر منٹو سوبھنا سمرتھ کے پاس چلا جاتا ہے، جو "مستور تھی"، اسی طرح ستارہ کا نیم عریاں جسم اس کی نگاہوں میں چبھتا ہے۔ لیکن اپنے انسانوں "ٹھنڈا گوشت" اور "بو" میں منٹو کا قلم جس عریاں نگاری اور فحاشی کا نمونہ پیش کرتا ہے اس کی مثال ان تحریروں میں ہی مل سکتی ہے جنہیں خصوصی طور سے Pornography فحش نگاری کے ضمن میں رکھا جاتا ہے اور جن کا کھلا مقصد جنسی اشتعال اور شہوت رانی ہے۔ عورت کے جسم کا صرف وہ حصہ جس کا جنسی تسکین کے وسیلوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا، منٹو کو دعوت کا نظارہ دیتا ہے۔ کسی کی ٹانگ اسے پسند ہوتی ہے تو کسی کی کہنی کی جلوہ کاری کا وہ منتظر رہتا ہے۔ کسی کی جلد کی صفائی اور چکناہٹ کا وہ دلدادہ نظر آتا ہے تو کسی کے لباس کی سادگی اور ستھرا پن اس کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن جب وہ کسی عورت کو انسانے کے تانے بانے میں پیش کرتا ہے تو اس کے سینے کا ابھار، اس کی سختی، اس کی گولائی اور ان کے علاوہ دوسری تشریحات انسانے میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لیتی ہیں۔ جن انسانوں میں منٹو خود کو بھی کسی نہ کسی حیثیت سے پیش کرتا ہے،

اس کا قلم تہذیب و شائستگی کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا۔ عورت کے جسم کے ہر اس حصے پر جس کا ہوسناکی سے تعلق ہوتا ہے منٹو نقاب ڈالے رکھتا ہے۔ جہاں کہیں وہ موقع کی مناسبت سے اس نقاب کو سرکا بھی سکتا تھا ایسا کرنے سے گریز کرتا ہے، لیکن ان افسانوں میں جن میں وہ واحد متکلم کا استعمال نہیں کرتا وہ جس بے باکی سے عورت کے ننگے جسم کو قاری کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور اس کی تشریح و بیان کرکے قاری کو جس جنسی تلذذ کی دعوت دیتا ہے اس کا خمیازہ وہ فحاشی کے الزام میں چار مقدموں کی صعوبتیں اٹھا کر بھگت چکا ہے۔

منٹو جب رفیق غزنوی کی جنسی بدعنوانیوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کی بہیمانہ ہوسناکی اور شہوت رانی منٹو کو بے حد گھناؤنی اور قابل نفریں نظر آتی ہے حالانکہ منٹو جب فلسفیانہ زاویہ نگاہ سے باپ بیٹی اور بھائی بہن کے جنسی تعلقات کا جائزہ لیتا ہے تو یہ تعلقات اسے ایک فطری میلان کا اظہار نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ان کے جواز کو انسانیت کے دامن پر ایک بدنما داغ سمجھتا ہے۔ اپنے اس خیال کے لیے کوتاہ نظر یا رجعت پسند سمجھا جانا منٹو کو گوارا ہے۔ رفیق غزنوی کا ذکر آنے پر منٹو کا اسے 'حرامزادہ' کہنا اسی طرح کے تعلقات پر منٹو کے منفی ردعمل کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن وہی منٹو باپ بیٹی کے جنسی تعلقات کو اپنے دو افسانوں 'کتاب کا خلاصہ' اور 'اللہ دتا' کا مرکزی خیال بنا کر پیش کرتا ہے۔

افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کی ذات غالباً اس معاملے میں منفرد ہے کہ اس نے اپنے بہت سارے افسانوں میں خود کو کسی نہ کسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حالانکہ کسی افسانے میں بھی اس کا رول مرکزی نہیں ہے۔ منٹو یا تو دوسرے کرداروں کی صف میں خود بھی کھڑا ہو جاتا ہے یا کہیں محض تماشائی بن کر یا دوسروں کی زبان سے اُن کی کہانی سن کر اسے افسانے کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ واحد متکلم کا استعمال وہ اسی حد تک کرتا ہے۔ اس کی کوئی کہانی میری نظر سے نہیں گذری جو صرف "میں" کے ارد گرد گھومتی ہو۔ جس کی مثال ہمیں دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ اس طرح منٹو کی اپنے اکثر افسانوں میں کہیں کہیں تو بے ضرورت بھی موجودگی بادی النظر میں سمجھ میں نہیں آتی۔ خاکوں میں منٹو اگر اپنے آپ کو شامل کرتا ہے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، خاکے ان شخصیتوں کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات اور تجربات پر مبنی ہیں جو ان خاکوں

کے موضوع ہیں۔ لیکن اکثر افسانوں میں اس کا موجود رہنا عجیب سی بات ضرور ہے۔
منٹو اپنے خاکوں میں اپنے اور دوسروں کے متعلق کسی واقعہ کا ذکر کرتے وقت کافی تفصیلات میں چلا جاتا ہے۔ چنانچہ راقم نے منٹو کی سرگذشت د حالات زندگی مرتب کرنے میں ساری تفصیلات خود اس کے اپنے بیانات سے ہی مہیا کی ہیں۔ لیکن اپنی شادی کا ذکر منٹو سرسرا ہے کرتا ہے۔ حالانکہ اس کی ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے نہایت مستحسن اور کامیاب تھی۔ منٹو ممد بھائی اور ددوا پہلوان کی لنگوٹ بندی کا ثنا خواں ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت کے ساتھ ازدواجی تعلق کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ اس صورت میں یہ سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ شادی کی تحریک خود منٹو کے اندر پیدا ہوئی اور یا اس نے ماں کی خاطر شادی کے لیے رضامندی ظاہر کی ؟ منسوب کی پختگی کے سلسلے میں منٹو کو کئی بار ماہم جانا پڑا تھا۔ یہ سلسلہ جنبانی کسی اور کے ذریعہ ہو رہی تھی یا منٹو خود شادی کی بات چیت میں حصّہ لے رہا تھا؟ صفیہ کے والدین کون اور کیا تھے ؟ شادی سے پہلے منٹو کی صفیہ سے ملاقات ہو چکی تھی یا کم از کم منٹو کی ماں اسے دیکھ چکی تھی۔؟ صفیہ کا انتخاب اس نے خود کیا تھا یا اس معاملے کو اس نے اپنی ماں کی پسند پر چھوڑ دیا تھا؟ اس بات کا ذکر بھی کہ نکاح پہلے ہو چکا تھا اور شادی کچھ دنوں کے بعد ہوئی، منٹو نے کہیں خاص طور سے نہیں کیا ہے۔ منٹو صرف اتنا کہہ کر نکل جاتا ہے کہ "میری شادی عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ کچھ ایسے قصے تھے کہ میرے گھر میں سوائے میری والدہ کے کوئی اور نہ تھا۔"
وہ حالات کیا تھے ؟ منٹو کے گھر میں کون سے قصّے کھڑے ہو گئے تھے ؟ ان سارے سوالات کے جواب منٹو کی شخصیت کی تشکیل اور اس کا طور سمجھنے میں معاون ہوتے۔ شادی کی تفصیلات بیان کرنے سے منٹو کا احتراز یہ گمان پیدا کرتا ہے کہ اپنی شادی کا تصور اور اس کا ذکر منٹو کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیتا تھا۔

چند نفسیاتی حقائق

متذکرہ بالا گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ہم اپنے قاری کو چند نفسیاتی حقائق سے روشناس کرانا چاہیں گے ۔

ایک نوزائیدہ بچے کی توجہ اور دل چسپی کا مرکز ماں کی آغوش ہوتا ہے ۔ ماں کی آغوش ہی اُس کی غذائی حاجت روائی کا سامان کرتی ہے اور یہی اس کو اُس اولین مسرت اور شاد کامی کے تجربے سے آشنا کرتی ہے جو اُسے نفسیاتی تسکین و طمانیت سے ہمکنار کرتا ہے ۔ بچہ ماں کی آغوش کے لیے بے چین رہتا ہے ۔ ماں سے علیٰحدگی اُسے شدید اضطراب میں ڈال دیتی ہے جس کا اظہار اُس کی گریہ وزاری اور چیخ وپکار کی صورت میں ہوتا ہے ۔ اُس وقت ماں کی مکمل ذات کا کوئی تصوّر بچے کے ذہن میں قائم نہیں ہوتا، ماں کا سینہ ہی ایک ایسی خارجی شے ہوتی ہے جس کے لیے بچّے کے اندر مقناطیسی کشش ہوتی ہے ۔ بیداری کی حالت میں ماں کا سینہ صرف بچّے کے کام ودہن کو ہی لذت آشنا نہیں کرتا، بچے کے ہاتھ بھی اُس کے لمس سے لذت گیر ہوتے ہیں ۔ رفتہ رفتہ جب بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے تو ماں کا پورا مادی وجود اُس کے لیے پُرکشش بن جاتا ہے ۔ بچہ صرف ماں کی ہم آغوشی ہی کا طلب گار نہیں ہوتا ۔ ماں کی موجودگی بھی اس کے لیے باعثِ تسکین و مسرّت ہوتی ہے ۔ نگاہوں سے ماں کا اوجھل ہونا بچّے کی شدید ناخوشگواری کا باعث بن جاتا ہے ۔ ماں کے لیے بچّے کی طلب محض یک طرفہ نہیں ہوتی ۔ توسیع نسل کا فطری تقاضہ بچے کو ماں کی توجہ اور دل چسپی کا مرکز بنا دیتا ہے ۔ بچہ شکمِ مادر میں نو ماہ تک ماں کے خون سے پرورش پاتا ہے ۔ حمل کی یہ طویل مدت ماں کے لیے نہایت صبر آزما ہوتی ہے ۔ وہ اس روز افزوں بوجھ سے نجات کی

آرزومند رہتی ہے اور جب ایک جان لیوا اذیت سے گذر کر اپنی آغوش میں ایک
جیتا جاگتا کھلونا دیکھتی ہے تو اُسے ایک عجیب وغریب نفسیاتی مسرت حاصل ہوتی ہے
جس سے اس کھلونے کی قدر و قیمت اُس کی نگاہ میں دنیا کی ہر دوسری شے سے
زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دو ڈھائی سال تک وہ بچے کو کلیجے سے لگائے رکھتی
ہے۔ جس طرح بچہ ماں سے چمٹا رہتا ہے اسی طرح ماں کی ممتا بھی بچے سے علیحدگی
گوارا نہیں کرتی۔ بچے کو کلیجے سے لگائے رکھنے میں اُسے ایک غیر معمولی راحت
نصیب ہوتی ہے۔ بچے کی مسکراہٹ ماں کے چہرے کو شگفتہ اور اس کی تکلیف کا
احساس ماں پر افسردگی طاری کر دیتا ہے۔ بچے کو عافیت پہنچانے کے لیے ماں اپنا
آرام و عافیت قربان کرنے کے لیے اضطراری طور پر آمادہ رہتی ہے۔ ماں اور بچے
کے درمیان ایک ایسے شدید جذباتی لگاؤ کی نیو تیار ہو جاتی ہے جس کی مثال نہیں
مل سکتی۔ دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے شیفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک
دوسرے کو اپنی نگاہوں سے جدا کرنا گوارا نہیں کرتے۔

باپ کا بچے کے ساتھ وہ جذباتی تعلق نہیں پیدا ہوتا جو ماں کا بچے کے ساتھ
ہوتا ہے۔ مرد توسیع نسل کا حیاتیاتی تقاضہ ایک ساعت میں عورت کے شکم کی
تخم ریزی کر کے پورا کر لیتا ہے۔ ماں کو اس کی تکمیل میں تین چار سال کی مدت لگ
جاتی ہے۔ کم از کم دو ڈھائی سال تک بچے کی غذائی حاجت پوری کرنے کے لیے بچے
کے ساتھ ماں کی وابستگی ضروری ہے۔ اُس کے بعد بھی بچے کا جسم ناتواں ماں کی
توجہ اور التفات کا محتاج رہتا ہے۔ اُس کی عافیت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری ماں
کے سر پر رہتی ہے۔ ماں اور بچے کے جذباتی رشتے کی یہ طوالت اس رشتے میں
استحکام پیدا کر دیتی ہے۔ عام طور پر باپ کو یہ طوالت ناگوار گذرتی ہے۔ وہ اس میں
رخنہ اندازی کرنے لگتا ہے۔ اس کی خاطر ماں کو اپنے فطری تقاضے کی برآوری
میں سہل انگاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ فطرت اُسے بچے کی طرف کھینچتی ہے۔ شوہر
کی خاطر داری چار و ناچار اُسے اپنی توجہ اور دل چسپی بچے سے ہٹانے پر مجبور کرتی ہے۔ بچے
کو ماں کے التفات میں باپ کی شرکت گراں گذرتی ہے۔ ماں کی مجبوری کا اُسے
احساس ہوتا ہے اور باپ کو اس کا تنہا ذمہ دار محسوس کرنے لگتا ہے۔ باپ سے اسے

مخاصمت پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایک طرف ماں کی مادی قربت کا شدید تقاضہ اور ماں کے ساتھ بچے کی گہری جذباتی وابستگی اور دوسری طرف ماں کی محبت میں باپ کی شرکت سے آزردگی، بچے کے اندر ماں اور باپ کی طرف متضاد رویوں کا سبب بن جاتی ہے۔ بچہ جہاں ماں سے محبت کرتا ہے وہیں باپ کے لیے اُس کے اندر رشک و رقابت کے معاندانہ جذبات نمو پاتے لگتے ہیں۔ والدین کے ساتھ بچے کے یہ مختلف اور متضاد رجحانات کسی دقیق رس نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔

والدین کے تئیں ان متصادم اور متضاد رویوں کے پیچھے جس بنیادی نفسی تحریک کا عمل ہوتا ہے اُسے فرائڈ نے ایڈی پس کمپلکس (Oedipus Complex) کہا ہے۔ اس کا رشتہ فرائڈ انسانی ارتقا کے اُس عہد سے جوڑتا ہے جسے حیوانیت اور انسانیت کا عبوری دور سمجھا جا سکتا ہے۔ جب حیوان نما انسان امتناع تزویج محرکات (Incest barrier) کا پابند نہیں تھا۔ جب جنس مخالف کے ہر فرد کے ساتھ جنسی تعلق پیدا کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا۔ بعد کی نسلوں میں اس حیوانی میلان کی حیثیت ایک نسلی ورثہ کی ہو گئی جس کی جڑیں آج بھی لاشعور کی اتھاہ پہنائیوں اور گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ راقم اپنے اس مقالے میں ایڈی پس کمپلکس کی مزید وضاحت میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہے۔

طفولیت کے اوّلین دور سے گذرنے کے بعد والدین کی طرف بچوں کے رویّوں میں تبدیلی ماہیت رونما ہونے لگتی ہے۔ فطرت لڑکے کے اندر اُس منصب سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیتوں کی نیو تیار کرنے لگتی ہے جو آگے چل کر ایک بالغ مرد کی حیثیت سے اُسے ادا کرنا ہے۔ اس منصب کے قابل بننے کے لیے باپ کی شخصیت لڑکے کے لیے نمونے کا کام کرتی ہے۔ باپ کی طرف لڑکے کے اندر فطری کشش پیدا ہونے لگتی ہے۔ باپ کے لیے خوش آئند احساسات و جذبات کا جنم ہونے لگتا ہے۔ لیکن باپ سے مخاصمت اور معاندت کے رجحانات قطعاً معدوم نہیں ہو جاتے۔ ان متضاد رجحانات کے درمیان کشمکش کا عموماً ایک ہی حل ہوتا ہے۔ یعنی شعوری طور پر لڑکا باپ کے تئیں خوشگوار جذبات کا حامل ہو جاتا ہے اور باپ سے وابستہ معاندانہ اور مخاصمانہ رجحانات لاشعور میں جاگزین ہو جاتے ہیں۔ باپ سے وابستہ تصورات و جذبات کی تبدیل ماہیت کے ساتھ ساتھ ماں کی محبت بھی جو ابتدا میں ماں کی جسمانی قربت اور ہم آغوشی

کی مادی خواہشات میں رونما ہورہی تھی رفتہ رفتہ ایک غیر مرئی صورت اختیار کرنے لگتی ہے۔ ماں کے اندر شفقت و احترام کے نرم و نازک احساسات رو پذیر ہونے لگتے ہیں۔ لڑکے کے لیے ماں کا تصور اور اُس سے وابستہ محرکات و جذبات کچھ اس نوعیت کے ہوجاتے ہیں جو سن بلوغ تک پہنچنے پر دوسری عورتوں کی طرف اس کے میلانات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ دوسری عورتوں کو جنسی تسکین کا وسیلہ سمجھنے میں اسے عار نہیں ہوتا لیکن ماں اُس کے لیے اس دائرے سے بالکل خارج ہوجاتی ہے۔ ماں اس کے لیے جنس مخالف کی دوسری عورتوں سے جداگانہ حیثیت کی حامل ہوجاتی ہے۔

والدین سے وابستہ تصورات اور رجحانات کی تبدیل ماہیت میں لڑکے کے ساتھ باپ کے رویّے کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلم الثبوت کُلیہ ہے کہ محبّت سے محبّت پیدا ہوتی ہے اور نفرت سے نفرت۔ اگر لڑکا باپ کے رویّے میں اپنے لیے گرم جوشی اور مروّت، دلداری اور قدر شناسی کے نشانات پاتا ہے تو باپ کے ساتھ اُس مثبت رجحان کو جو ایک فطری میلان کی صورت لڑکے کے اندر نمو پارہا ہوتا ہے تقویت حاصل ہونے لگتی ہے اور والدین کی نسبت اُس کے تصورات و احساسات کی تبدیل ماہیت کا عمل آسان ہوجاتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر باپ کے برتاؤ میں لڑکے کو سخت دلی، بے مروتی، اور ناقدری کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں تو باپ کے ساتھ اُس کے فطری مثبت رجحانات کی جڑیں کمزور ہوجاتی ہیں۔ باپ کے سانچے میں ڈھلنے کا فطری تقاضہ متزلزل ہونے لگتا ہے۔ باپ کے ساتھ طفلانہ رشک و رقابت کے جذبات قائم ہی نہیں رہتے بلکہ اُن میں اُستواری آجاتی ہے اور ماں کے ساتھ اس کی طفلانہ مادی سرگرمیوں، ہم آغوشی اور ہمکناری کے تقاضوں میں ٹھہراؤ (Fixation) پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کی تبدیل ماہیت میں رکاوٹ کھڑی ہوجاتی ہے۔ ماں کے سینے سے چمٹے رہنے کی خواہش اُس کے لاشعور میں موجزن رہتی ہے۔ اور لاشعور کے نہاں خانوں میں اُن حیوانی جنسی تقاضوں کے ساتھ مدغم ہوجاتی ہے جو نسل انسانی کے اوّلین دور کی زندہ یادگاروں کی صورت میں ہنوز سرگرم عمل ہیں۔ ان کا شعوری اظہار فرد کے اُن تہذیبی اور اخلاقی قدروں سے ٹکرانے لگتا ہے جن کا معاشرے کی تعلیم و تربیت اُسے پابند بنا دیتا ہے۔ وہ ایک ایسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوجاتا ہے جو اس کے اندر شدید گناہ اور شرم کے

احساس کو پروان چڑھاکر اُسے ایک جاں گداز اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہے ۔ عورت کے ساتھ جنسی تعلق کے خلاف ایک دیوار کھڑی ہوجاتی ہے اور صنفِ مخالف کی طرف جنسی اقدام پر ایک لاشعوری روک لگ جاتی ہے ۔ لیکن جنسی تسکین کے فطری تقاضوں کے سوتے خشک نہیں ہوجاتے ۔ ان کی تحریک جاری رہتی ہے جس کا اظہار تخیل و تصوّر کے پردوں پر کبھی خواب کی صورت میں اور کبھی غیر حقیقی اور خیالی (Fantastic) تخلیقات کے قالب میں ہوتا رہتا ہے ۔

والدین کے متعلق بچے کا جو تصور اور رویّہ ہوتا ہے آئندہ زندگی میں دوسرے افراد کی بابت اُس کا تصوّر اور رویہ ان کے مماثل ہوگا ۔ اگر بچّے کے دل میں باپ کا احترام ہے اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے میں اُسے کوئی جھجک نہیں ہوتی تو جن دوسرے بزرگوں اور مقتدر ہستیوں سے اسے واسطہ پڑے گا ان کا احترام اور ان کی اطاعت و پیروی اُس کی طبیعت کا خاصہ بن جائے گی ۔ اس کے برعکس اگر باپ کی شخصیت بچے کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہوگی اور اُس کی خلاف ورزی کی ترغیبیں اس کے اندر پیدا ہوتی رہتی ہیں تو دوسروں کے متعلق بھی اُس کے اندر ویسے ہی تصورات و جذبات قائم ہوجائیں گے ۔ اسی طرح اگر بچہ ماں کی محبت و شفقت اور اُس کے جذبہ ایثار و خدمت سے متاثر ہوگا تو دوسری عورتوں کو بھی وہ ویسی ہی پیکرِ خلوص و محبت ، دردمندی و دلداری تصوّر کرنے لگے گا ۔

والدین خصوصاً باپ کے رویّے کا اثر بچّے کی شخصیت کی تشکیل پر بھی پڑتا ہے ، ابتدا میں بچے کی شخصیت میں کوئی نظم و ربط نہیں ہوتا ۔ اُس کی حرکتیں محض جبلی تحریکوں کا اضطراری اظہار ہوتی ہیں ۔ یہ جبلی تحریکیں عضویاتی اور جنسی نوعیت کی ہوتی ہیں اور لاشعور کے نہاں خانوں سے بچے کے افعال پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں ۔ جیسا سطور بالا میں بیان کیا جاچکا ہے ، ان کا رشتہ ان قدیم میلانات سے ہے جن کی حیثیت نسلِ انسانی کے ارتقا میں حیوانیت اور انسانیت کی مشترکہ قدروں کی ہے ۔ وہ تہذیب و تمدن کی آراستگی سے قطعاً محروم ہیں ۔ بچّے کے جنسی مطالبات جن کا اظہار اوائل میں مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے ان ہی میلانات کے کرشمے ہیں ، بچے کے اندر ماں کی ہم کناری اور جسمانی اختلاط کا تقاضہ بھی اُس کے جنسی میلان کی حاجت روائی کا سامان ہے ۔ باپ

کے ساتھ رشک و مخاصمت کے رجحانات کا تعلق بھی بچے کے جنسی میلان سے ہی ہے۔
ماں کے ساتھ باپ کے التفات کو وہ اپنے جنسی تقاضوں کی راہ میں ایک رکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں غصے کے جذبات بھڑک کر معاندت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے معاشرہ اسے اپنے جبلی تقاضوں پر قابو رکھنے کا درس دینے لگتا ہے۔ نیک و بد، پسندیدہ و ناپسندیدہ، مقبول و مذموم کا فرق، بچہ رفتہ رفتہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس درس اخلاق کا سب سے پہلا معلم اور اس اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل اُس کا باپ ہوتا ہے۔ اُس کا باپ اسے صرف اچھے اور برے میں تمیز کرنا ہی نہیں سکھاتا۔ اُس کے اچھے یا برے فعل، معاشرہ کے رسم و رواج کا احترام اور اُن سے انحراف پر، اُسے جزا و سزا کے تجربوں سے بھی آشنا کرتا ہے۔ ابتدا میں باپ کی تنبیہہ و تادیب ہی بچے کو ہر اُس فعل سے روکتی ہے جو اُس کے معاشرے میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور اُس فعل کی طرف مائل کرتی ہے جسے اُس کا معاشرہ پسند کرتا ہے۔ پسندیدہ اطوار کا مالک بننے اور معاشرہ کے رسوم و قیود پر کاربند ہونے کے لیے بچے کو باپ کی ہدایتوں پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ خود اس کی شخصیت کے اندر ایک ایسا نظام وجود میں آنے لگتا ہے جو کسی خارجی وسیلے کے بغیر داخلی طور پر اُسے نیک و بد کی تمیز کرا دے۔ شخصیت کے اس نظام کو سپر ایغو (Super Ego) یا فوق انا کا نام دیا گیا ہے۔ فرد کی شعوری ذات کو ایغو (Ego) یا انا کہا گیا ہے۔ ایغو کے اقدام کے بغیر فرد کے اعضا متحرک نہیں ہو سکتے۔ اُس سے کوئی فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ فرد اپنی انا کے لیے واحد متکلم یعنی 'میں' کا استعمال کرتا ہے۔ شخصیت کے لاشعوری، غیر منظم اور غیر تہذیب یافتہ مطالبات، محسوسات اور تحریکوں کو فرد اپنی "میں" میں شامل نہیں کرتا۔ اسی لیے اُس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لاشخصی ضمیر (id) کا استعمال کیا جاتا ہے جو انگریزی کے it کا لاطینی مترادف ہے۔ اس طرح آدمی کی شخصیت رفتہ رفتہ تین حصوں میں بٹ جاتی ہے، اِڈ، ایغو اور سُپر ایغو۔ سپر ایغو کی کارکردگی ضمیر کی نیش زنی کے ذریعے رونما ہوتی ہے۔ جب فرد سے کوئی لغزش ہوتی ہے، جب وہ اخلاقی یا ثقافتی قدروں کی پامالی کا مرتکب ہوتا ہے، تو اُس کا ضمیر اُسے ندامت اور عصیاں کے اضطراب آگیں

احساسات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہے، سُپر ایغو باپ کے خارجی اقتدار کا داخلی قائم مقام ہے۔ باپ اور ماں سے وابستہ طفلانہ تصورات اور اُن کے تئیں رویوں کی تبدیل ماہیت سُپر ایغو کی رہنمائی کی منت کش ہے۔ بچہ جب اپنے حیاتیاتی سفر کے مراحل سے گذرتا ہوا سن بلوغ کو پہنچ جاتا ہے تو عام طور پر اس کا ایغو خارجی اور داخلی محرکات کو اپنے قابو میں رکھنے کا اہل بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ساری توانائی کا مالک اور اڈ کے تقاضوں اور سُپر ایغو کے مطالبات میں موافقت رکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ وہ اڈ کی ترغیبوں کے آگے بے بس نہیں ہو جاتا۔ اُن کی جانچ پڑتال کر کے ہی اُنہیں اذنِ اظہار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ سُپر ایغو کے مطالبات کی اندھی تقلید نہیں کرتا۔ اُس کا ایک غیر مبہم نصب العین اور نظام اقدار ہوتا ہے۔ وہ اڈ اور سُپر ایغو دونوں ہی کو اس نظام کے تابع رکھتا ہے۔ معاشرہ کے رسم و رواج کو وہ عقل و دانش کی روشنی میں پرکھ کر ہی ان پر عمل کرتا ہے۔ اخلاقی اور ثقافتی مسائل کا حل بھی وہ چند بنیادی اخلاقی قدروں کی روشنی میں کر کے ہی ان سے نپٹ لیتا ہے۔ اس کے سپر ایغو میں درشتی کے بجائے لچکیلا پن ہوتا ہے۔ ایغو موقع کی مناسبت سے اُس سے انحراف کرنے میں جھجک نہیں محسوس کرتا۔ سُپر ایغو کی گرفت اس پر ڈھیلی رہتی ہے۔ ایسے ہی تنومند اور توانا ایغو کو نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اڈ جسے نفس امارہ کا مترادف سمجھا جاسکتا ہے اور سپر ایغو جسے ہم نفس لوامہ بھی کہہ سکتے ہیں، یہ دونوں نفس مطمئنہ کے مطیع رہتے ہیں۔ دونوں ہی پر اُس کی دسترس رہتی ہے۔ دونوں ہی کے مطالبات کو وہ اپنی رضا سے رد یا قبول کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے ذہنی کشمکش اور کرب کا مُنہ نہیں دیکھنا پڑتا۔

اگر طفولیت سے بلوغیت کے سفر میں فرد کو مشکلات اور مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو ہر مرحلے پر ایغو اپنی توانائی کھوتا چلا جاتا ہے۔ بلوغیت کی منزل پر پہونچ کر اُس کی ناتوانی اُسے ایک طرف اِڈ کی ترغیبوں اور دوسری طرف سُپر ایغو کے مطالبات کے آگے سپر اندازی پر مجبور کر دیتی ہے۔ اُس کی حیثیت اُس خادم کی ہوتی ہے جسے دو مختلف آقاؤں کی رضا جوئی کی فکر لگی رہتی ہے۔ ان کے متضاد و متصادم مطالبات اُسے عجیب کشمکش میں مبتلا رکھتے ہیں۔ کبھی ایک کو راضی کر کے اُسے دوسرے کو ناراض

کرنا پڑتا ہے اور کبھی دوسرے کی رضامندی کے بدلے اُسے پہلے کی ناراضگی مول لینی ہوتی ہے۔ ایغو اگر اِڈ کے تقاضوں کی رواداری کرتا ہے تو اُسے سُپر ایغو کی تادیب کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور اگر سپر ایغو کی سرزنش سے بچنے کے لیے اِڈ کے مطالبات کو رد کر دیتا ہے تو اسے اُس مسرت اور آسودگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے جو جبلی ترغیبات کی تسکین سے حاصل ہوتی ہے۔ ایغو کی توانائی اور ناتوانی کا انحصار بچے کے تئیں باپ کے اچھے یا بُرے برتاؤ پر ہے۔ اگر لڑکے کی کوئی لغزش اُسے باپ کے قہر وعتاب کا نشانہ بنا دیتی ہے، اگر اسے باپ کی شفقت و ہمدردی نصیب نہیں ہے، اگر باپ کی خشمگیں نگاہوں سے بچنے کی فکر اُسے ستاتی رہتی ہے، تو اُس کا سُپر ایغو جو باپ کا داخلی قائم مقام ہے ویسا ہی غضب آلود اور سخت گیر ہوگا۔ اِڈ کے مطالبات کی رواداری کا خمیازہ، ایغو کو سُپر ایغو کی تشنیع و ملامت کے تیر و نشتر کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔ ایک طرف ایغو کی ناتوانی فرد کو اِڈ کے تقاضوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور کر دے گی، تو دوسری طرف سُپر ایغو کی برانگیختگی اور عتاب اس کی جمعیت خاطر کی بنیادوں کو ہلا دے گی۔ اُسے شدید محرومی کے احساس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ فرد اپنی ذات میں ایک ایسی خامی، ایک ایسا خلا محسوس کرے گا جسے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ طمانیت و آسودگی اُس کے پاس بھٹکنے نہیں پائے گی۔ وہ شدید ذہنی اضطراب و انتشار میں مبتلا رہے گا۔

بیسواؤں اور معاشرے میں بدنام عورتوں سے ہمدردی

منٹو کے افسانوں میں کلیدی کردار کی حیثیت سے راقم نے سات عورتوں کی شخصیت کا ایک ایجازی مرقع سطور بالا میں پیش کیا ہے۔ ان میں سوگندھی، شاردا، شانتی اور زینت پیشہ ور طوائفیں ہیں۔ ان میں سے کسی کو پیشے سے دلچسپی نہیں تھی نہ کسی کو روپے پیسے کا لالچ تھا۔ کسی ایک کی ہو جانے کی آرزو ان کے دلوں میں مچلتی رہتی تھی۔ حالات نے انہیں اپنا جسم بیچنے کا پیشہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ **سوگندھی** کا جو بھی گاہک اس سے محبت جتاتا سوگندھی کے دل میں اس کی جگہ بن جاتی تھی۔ مادھو سوگندھی کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ بجائے اُس پر کچھ خرچ کرنے کے سوگندھی ہی جب مادھو پونا سے آتا دس پندرہ روپے اُس پر خرچ کر دیتی۔ وہ ہر بار سوگندھی کو تاکید کرتا کہ وہ اپنا پیشہ ترک کر دے اور خرچ کے لیے روپے بھیجنے کا وعدہ کرتا۔ لیکن اس کا وعدہ کبھی پورا نہ ہوتا پھر بھی سوگندھی اُس کی بناوٹی محبت کی شکار بنی رہتی۔ ماں بننے کی آرزو سوگندھی کے دل میں کروٹیں لیتی رہتی۔ اپنے پاس لیٹے ہوئے مرد کو دیکھ کر اُس کی ممتا کبھی کبھی جاگ اٹھتی۔ وہ بھول جاتی کہ وہ ایک بیسوا ہے جس کی گود عموماً خالی رہتی ہے۔ اُس کے دل میں دوسری مجبور عورتوں کا درد تھا اور ان پر اپنی کمائی کا پیسہ خرچ کرنے میں اسے عار نہیں تھا۔ ذلت و رسوائی کی زندگی جھیلنے کے باوجود اُسے اپنی عزتِ نفس کا پاس تھا۔ اپنی اہانت اسے قابو سے باہر کر دیتی تھی۔ **شاردا** کی ممتا اُس وقت یکبارگی جاگ اٹھتی ہے جب نذیر مُنّی کو اپنی بچی کی طرح گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگتا ہے۔ نذیر کے لیے نفرت و حقارت دفعتاً التفات و سپردگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب نذیر اُس سے علیحدگی اختیار کرنے کے

لیے اُس پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی پونجی اب ختم ہو چکی ہے تو شاردا اس کے دیے ہوئے سارے روپے اُس کو واپس کر دیتی ہے اور اپنے وطن جے پور واپس لوٹ جاتی ہے۔ نذیر کا شاردا کی بچی کو پیار سے گود میں اٹھا کر یہ کہنا کہ "اس کی ماں تو میں ہوں" شاردا کے دل میں نذیر کے لیے ایسی تڑپ پیدا کر دیتا ہے کہ جے پور جا کر اُسے چین نہیں ملتا، نذیر کی یاد اسے ستاتی رہتی ہے۔ نذیر کی بیوی کے غائبانہ میں اُس کے گھر آکر وہ نہایت خلوص اور بے لوثی کے ساتھ نذیر کی خدمت میں لگ جاتی ہے۔ شانتی جو ایک یہودی ڈاکٹر کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی ایک نوجوان کی بے وفائی کا زخم سینے میں چھپائے اپنے وطن کشمیر سے بھاگ کر بمبئی میں پیشہ شروع کر دیتی ہے۔ اسے بننے سنورنے کا کوئی شوق نہیں ہوتا وہ اپنے خریداروں کے ساتھ بالکل کاروباری انداز سے پیش آتی ہے۔ اپنے ہر گاہک کو وہ کامل بے حسی اور بے دلی کے ساتھ پچاس روپے کے عوض اپنے جسم کے استعمال کی اجازت دے دیتی ہے۔ مقبول نے جب اُسے پچاس روپے ادا کر کے اس کے جسم سے کوئی دلچسپی نہ لی تو حیرت کے ساتھ اُس نے مقبول کے روپے واپس کر دیئے۔ جب مقبول کے خلوص پر اُسے اعتبار آگیا تو اس کی ٹھکرائی ہوئی محبت میں، جو بالکل سرد ہو چکی تھی یکبارگی جان پڑ گئی اور وہ مقبول کی ہو گئی۔ **زینت** کے اندر شریف زادیوں کی ساری خوبیاں تھیں، وہ مجبور و بے بس ہو کر دوسروں کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی تھی، اسے کپڑے، زیور، موٹر، مکان کسی چیز کا لالچ نہیں تھا۔ منٹو نے جب اسے دلہن بنتے دیکھ کر کہا کہ "یہ کیا مسخرا پن ہے" تو زینت کے نازک احساسات کو ٹھیس لگی اور بولی "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان"

ممی اور **موذیل** پیشہ ور طوائف نہیں ہیں لیکن اُن کا تعلق بھی معاشرے کے ایسے طبقے سے ہے جسے نیچی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن کے دلوں میں بھی ایثار و خدمت کا ویسا ہی خالص جذبہ ہے جو اعلیٰ اخلاقی کردار والی عورتوں کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ ممی نے چڈے کے علاج معالجہ میں خلوص اور بے لوثی کا غیر معمولی نمونہ پیش کیا تھا۔ دن کترے کی بیوی کو جب اسقاط ہوا تو ممی کی بر وقت امداد نے اُس کی جان بچائی تھی۔ تھلما جب ایک سنگین مرض کی شکار ہو گئی تھی تو ممی نے بڑی دردمندی کے ساتھ اس کی مدد کی اپیل کی تھی۔ رام سنگھ جب میوزک ماسٹر سین کی ہوس پرستی سے بیزار ہو کر اُس کے قتل کا مرتکب ہوا

تو اُس کو پھانسی کے پھندے سے نکالنے کی فکر ممی کو دامنگیر ہو گئی ۔ رام سنگھ کو حاکم کے سامنے سچی باتیں بیان کرنے کی ہدایت کر کے ممی اُسے رہائی دلوانے میں کامیاب ہو گئی ۔ کمسن نی لس کی عصمت کو بے داغ رکھنے کے لیے اُسے اپنے منہ بولے بیٹے چاڈہ کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ یہ ایسی نیکیاں ہیں جن کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے ۔ ان کے علاوہ اپنے حلقے کے ہر فرد کے ساتھ اُس کی بے لوث مادرانہ شفقت اُس بے غرضانہ پیار و محبت سے کسی طرح کم نہیں تھی جو ایک ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے ۔ اسی طرح موذیل کی شرافت نفس اور ایثار کا جذبہ قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ ترلوچن موذیل پر فریفتہ تھا اور موذیل ایک معمولی سیلس گرل تھی ہاس کے باوجود ترلوچن کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے سے موذیل ہمیشہ احتراز کرتی تھی ۔ اپنی ساری بے حیائیوں کے باوجود اُس نے کبھی ترلوچن کو اپنے ساتھ ملوّث ہونے کی اجازت نہیں دی ۔ موذیل کی فرمائش پر سر اور داڑھی کے بال مُنڈانے کے بعد ترلوچن کا مردانہ حسن نکھر جاتا ہے موذیل اُس سے شادی کرنے کی رضامندی دے دیتی ہے لیکن اپنے یہودی مذہب کا پاس اُسے ایک سکھ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے سے روک دیتا ہے ۔ ترلوچن اپنے گاؤں کی لڑکی کرپال کور سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے ۔ وہ موذیل کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیتا ہے ۔ لیکن بجائے اُس سکھ لڑکی سے رشک و رقابت کے ، موذیل اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کے اس محلے میں جہاں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکی ہوئی تھی ترلوچن کو ساتھ لے کر داخل ہو جاتی ہے ۔ وہ کرپال کور کو فسادیوں کے چنگل سے آزاد کرا دیتی ہے اور اس کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو لیتی ہے ۔

جانکی ایک طوائف ہے لیکن پیشہ کرنے کے بجائے وہ فلم ایکٹرس بننے کی خواہشمند ہے ۔ ممی کی طرح ایثار و خدمت کا مادرانہ جذبہ اپنے اظہار کے لیے جانکی کو بھی بے چین رکھتا ہے ۔ جس طرح ایک ماں کو اپنی اولاد کی خاطر اپنا آرام و عافیت قربان کرنے میں روحانی لذت نصیب ہوتی ہے اسی طرح جانکی کو بھی اپنے چاہنے والے عزیز کی صحت کی فکر ستاتی رہتی ہے جب کبھی عزیز بیمار پڑتا ہے تو اُس کی بیوی سے زیادہ اپنی نیند حرام کر کے عزیز کی تیمارداری میں لگ جاتی ہے ۔ اسی طرح جب اُسے بمبئی میں فلم کمپنی میں ملازمت مل جاتی ہے تو سعید جیسے بے پروا اور لا اُبالی انسان کی دیکھ بھال

اور خیر و عافیت کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لیتی ہے جس طرح ممی چڑے وِن کرٹ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما اور تھلما سبھوں پر ماں کی جیسی بے لوث اور پر خلوص محبت نچھاور کرتی رہتی ہے اسی طرح جانکی بھی عزیز اور سعید کی خبر گیری اسی جذبہ ایثار و خدمت کے ساتھ کرتی ہے جو ایک ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔

ان عورتوں کے جن اوصاف کو منٹو اُجاگر کرتا ہے وہ اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ یہ ساری عورتیں منٹو کے لیے ماں کی قائم مقام ہیں۔ ان کے اندر اسے مادرانہ شفقت و محبت، خلوص و بے لوثی، ایثار و خدمت کا عکس نظر آتا ہے۔ بچے کو جو لگاؤ ماں سے ہوتا ہے اور جو تصور وہ ماں کے متعلق قائم کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کا رجحان بھی ان عورتوں کی طرف ویسا ہی ہے۔ ان عورتوں پر اُس کی نگاہ اُسی انداز سے پڑتی ہے۔ اس کا نفسیاتی سبب، جیسا ہم سطور بالا میں بیان کر چکے ہیں، ظاہر ہے۔ منٹو باپ کے قہر آلود وجود سے ماں کے دامن عافیت میں پناہ لیتا تھا۔ باپ کے ساتھ رشک و رقابت کی آگ اُس کے لاشعور میں برابر سُلگتی رہتی تھی۔ طفولیت کی سرحدوں سے نکل جانے کے بعد ماں کے ساتھ لڑکے کی وابستگی کی تبدیل ماہیت لڑکے کو باپ کی شخصیت میں ضم ہو جانے کی ترغیب دینے لگتی ہے۔ لیکن باپ کی درشتی اور بے مروتی نے منٹو کے اندر باپ کے ساتھ مغائرت اور مخاصمت کی جڑوں کو کمزور کرنے کے بجائے اور زیادہ استوار کر دیا تھا۔ منٹو کی شخصیت باپ کے بالمثل بننے کے بجائے اُس کی شخصیت کی ضد (Antitype) بن گئی۔ منٹو کا سارا خاندان رسمی تعلیم سے آراستہ اور مذہبی اور ثقافتی روایتوں اور قدروں سے وابستہ تھا۔ اس کے برخلاف منٹو باوجود غیر معمولی طور پر ذہین و فطین اور ایک جینیس (Genius) کی صلاحیتوں کا مالک ہونے کے، تعلیمی اور اخلاقی اعتبار سے ننگ خاندان سمجھا جاتا تھا۔ مذہب سے اُس کا لگاؤ بس اتنا ہی تھا کہ وہ اپنی ہر تخلیق شروع کرنے سے پہلے ۷۸٦ ضرور لکھتا تھا اور مذہبی پیشواؤں کا اس کے دل میں احترام تھا۔ منٹو کے لیے باپ کا وجود جور و استبداد کی علامت بن گیا۔ باپ کا یہ منفی تصور سماج پر چسپاں کر کے وہ اپنا جسم بیچنے والی عورتوں کو ماں کی طرح مجبور و بے بس سمجھنے لگا۔ اُس کا یہ طفلانہ احساس کہ ماں بچے کے ساتھ اپنی محبت و التفات میں باپ کو اپنی مرضی کے خلاف شریک کرنے پر مجبور تھی، اُس کے لاشعور میں

اپنی جگہ بنائے رہا۔ ان عورتوں کے متعلق جو اپنے جسم کا سودا کرتی ہیں، منٹو کے اندر ایسا ہی تصوّر قائم ہوگیا۔ وہ بھی اپنی محبت کسی ایک مرد کے لیے وقف کر کے اُس کی خدمت میں زندگی گذارنے کی آرزومند ہیں۔ ان کے دلوں میں بھی شریف زادیوں کی طرح اپنی گود بھر کر اپنی ممتا اور بے لوث محبت اپنی اولاد پر نچھاور کرنے کی تمنا کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ سماج کی سفاکی، زبردست آزاری، اور جذبۂ استحصال انہیں اپنا جسم ہر اُس گاہک کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو اُس کے دام چکا کر انہیں اپنا وجود باقی رکھنے کے قابل بنا سکے۔ راقم کے اس استنباط کی منٹو کے ایک اضطراری بیان سے تصدیق ہوتی ہے۔ اُس خود نوشت خاکے میں جس میں سعادت حسن منٹو، فنکار منٹو کی شخصیت پر رائے زنی کر رہا ہے، منٹو یوں رقم طراز ہے " منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ اُس کے والد خدا بخشے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ بے حد نرم دل۔ ان دو پاٹوں کے اندر پس کر یہ دانۂ گندم کس شکل سے باہر نکلا ہوگا اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔"

منٹو کی جنسی پاکبازی

بمبئی کے قیام میں منٹو ایک عرصہ تک بوالہوسی اور شہوت پرستی کے ماحول میں سانس لیتا رہا۔ اُس نے ایکٹرسوں سے دوستی کی، طوائفوں کے بالاخانوں پر گیا اُن کی صحبت میں اکثر وقت گذارتا رہا۔ نیلم جب بیمار پڑی تو منٹو نے اس کی مستقل تیمارداری کی (نیلم) لیکن ان میں سے کسی کا حسن وجمال اس کی معصوم نگاہوں کو آلودہ نہ کر سکا۔ فلمی اداکاروں اور ان کی بیویوں اور شوہروں کی بے عنان شہوت رانی کا تماشہ وہ اپنے چاروں طرف دیکھتا رہا تھا لیکن اُس سے مشتعل ہونے کے بجائے اُسے اُن لوگوں پر گھن آتی تھی۔ رفیق غزنوی کا ساری اخلاقی، مذہبی اور رسمی بندشوں کو ہوسناکی کی آگ میں بھسم کر کے بے دریغ جنسی آلودگی سے ملوث ہونا منٹو کے اندر نفرت اور حقارت کے جذبات کو بھڑکا دیتا تھا۔ اس کی ترجمانی رفیق کے متعلق منٹو کے اس جملے سے ہوتی ہے کہ " وہ حرام زادہ ہے"! ایسے ماحول میں منٹو کا جنسی آلائشوں سے دامن بچائے رکھنا صرف عجیب وغریب نہیں بلکہ غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً ان دنوں جب وہ غیر شادی شدہ تھا۔ کم سن اور حسین عورتوں کے جسم کے وہ اعضا منٹو کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے تھے جن کا مظاہرہ معصوم دلوں کے اندر بھی ہوس کی دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکا دیتا ہے بلکہ ایسے اعضا کی برہنگی منٹو کی آنکھوں میں چُبھنے لگتی تھی۔ وہ اپنی نگاہیں دوسری طرف کر لیتا تھا۔ منٹو کے دل میں ایسے لوگوں کی قدر و منزلت تھی جو اپنے شہوانی جذبات پر اُس حد تک قابو کر لیتے ہیں کہ کسی عورت کے ساتھ بھی ہم بستری انہیں گوارا نہیں ہوتی، جنہیں اپنی لنگوٹ بندی پر ناز ہوتا ہے۔ منٹو جیسے روشن خیال شخص کے لیے یہ کم عجیب

بات نہیں ہے۔ کوئی ترقی یافتہ ذہن لنگوٹ بندی کی قصیدہ خوانی نہیں کرسکتا۔ اس کا رواج آدمی کو صرف ازدواجی زندگی کی لطافتوں سے محروم نہیں کردے گا بلکہ انقطاع نسل کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ زندگی کا سب سے اہم مقصد یعنی بقائے نسل، فوت ہوجائے گا۔ ماں کی ذات باپ کے مقابلے میں اسی بنا پر زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بقائے نسل کا فطری تقاضہ باپ کی بہ نسبت ماں کے ہاتھوں زیادہ پورا ہوتا ہے۔ منٹو کے الفاظ خود اس کی تصدیق کرتے ہیں " اس نے سوچا ماں بننا کتنا اچھا ہے۔ مرد کھاپی کر سب ہضم کرجاتے ہیں۔ عورتیں کھاتی ہیں تو کھلاتی بھی ہیں۔ کسی کو پالنا، اپنے بچے کو ہی، کتنی شاندار چیز ہے" (شاردا)

منٹو نے اپنے خاکوں میں کسی کی صرف تعریف ہی نہیں کی ہے۔ ہر ایک کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ خود منٹو کے بیان کے مطابق باری علیگ کا اس پر بہت بڑا احسان تھا۔ اگر اسے اُن کی توجہ اور شفقت میسر نہ ہوتی تو وہ اتنا عظیم فن کار نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن وہ باری صاحب کی بزدلی اور رنجھوریت پر طنز کرنے سے باز نہیں آتا۔ اس کے خیال میں باری صاحب اپنی بے مثال ذہانت اور علمی صلاحیت کے بل پر " بڑی بڑی نرالی باتیں اور اسکیمیں سوچتے تھے۔ جو کسی اور کے ذہن میں آسانی سے نہیں آسکتیں۔ لیکن یہ اتنی سُرعت سے غائب ہوجاتی تھیں کہ ان کے آثار تک بھی باقی نہ رہتے تھے"۔ وہ میدان تیار کرتے لیکن میدان چھوڑ کر دفعتاً بھاگ جایا کرتے تھے۔ منٹو نے ان کی اس خصوصیت کی ترجمانی کے لیے "رنجھوریت" کی اصطلاح وضع کی تھی۔ آخری دنوں میں باری صاحب برٹش انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوگئے تھے: " وہ انگریزوں کے دشمن تھے لیکن یہ طرفہ تماشہ ہے کہ جب انگریز چلا گیا تو وہ اُسی کے نوکر ہوگئے"۔ (باری صاحب) اسی طرح منٹو اشوک کمار کی پاکبازی اور بے داغ خانگی زندگی کا صدق دل سے معترف تھا۔ لیکن اشوک کے دل کا چور پکڑنے سے بھی منٹو باز نہیں آتا۔ (اشوک کمار)۔ رام سروپ، معروف فلم ایکٹر کی ایک منفرد ذات ہے جس کے اندر منٹو کو کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ رام سروپ کی شخصیت پر اُسے تعجب ضرور ہوتا ہے، اس کا خالی ڈبوں اور خالی بوتلوں کا انبار لگانا منٹو کے لیے ایک نفسیاتی گتھی تھی (خالی ڈبے خالی بوتلیں)۔ رام سروپ کا ایکٹریسوں کو اپنے پاس بھٹکنے نہ دینا منٹو کو بہت پسند معلوم ہوتا ہے۔ منٹو کو اس بات پر تعجب تھا کہ

کسی نے بھولے سے بھی اس حیرت کا ذکر نہیں کیا تھا کہ فلمی دنیا میں رہ کر رام سروپ کی زندگی جنسی آلائشوں سے پاک ہے۔" منٹو رام سروپ کی صحبت سے کافی لطف اندوز ہوتا تھا۔ فرصت کے اوقات میں وہ اکثر اس کے یہاں جایا کرتا تھا اور اس کے ساتھ رم پیتا یا تاش کھیلا کرتا تھا۔ منٹو کے خاکوں سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اپنے دوسرے فلمی دوستوں سے اس درجہ بے تکلف تھا اور بے ضرورت بھی ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ منٹو جب کبھی رام سروپ سے سوال کرتا کہ وہ شادی کب کرے گا تو رام سروپ کا جواب "شادی کر کے کیا کروں گا" منٹو کو نامناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ دل میں سوچنے لگتا تھا کہ" واقعی رام سروپ شادی کر کے کیا کرے گا۔" وہ "اس سے شادی بیاہ کا تذکرہ اکثر کرتا تھا مگر تصور پر زور دینے کے باوجود اُسے کسی عورت سے منسلک نہ دیکھ سکتا تھا۔"

مندرجہ بالا ساری باتیں ہمیں لازمی طور پر اس نتیجے کی طرف لے جاتی ہیں کہ کوئی داخلی زبردست طاقت منٹو کو غیر عورتوں سے جنسی تعلق پیدا کرنے سے روکے رہی تھی۔ بچے کے لیے ماں سے مادی وابستگی، اس کی جسمانی قربت کی خواہش ایک فطری تقاضہ ہے۔ لیکن منٹو کے نامساعد حالات جن سے اس کا بچپن گذرا تھا، اس تقاضے کی تبدیل ماہیت میں مزاحم ہو گئے تھے۔ یہ تقاضہ اپنی اصلی صورت میں اس کے لاشعور میں جگہ بنائے رہا۔ ماں کی محبت اور کسی غیر عورت سے جنسی وابستگی کے فرق کا ہیولیٰ تیار نہ ہو سکا۔ جس کی بنیاد پر یہ فرق زیادہ سے زیادہ واضح ہوتا چلا جاتا۔ منٹو کو محبت کے لفظ سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ عصمت نے جب منٹو سے کہا کہ اسے صفیہ سے محبت تھی تو منٹو کا ردعمل کچھ ایسا تھا جیسے اسے "گالی" دی گئی ہو۔ (منٹو میرا دوست میرا دشمن) محبت اور جنسی آلودگی منٹو کے لیے ہم معنی اصطلاحیں تھیں۔ وہ ندیم قاسمی کو اپنے ایک خط میں لکھتا ہے "حُسن اور محبت کے بارے میں سوچتا ہوں تو صرف شہوت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوت سے الگ کر کے میں دیکھتا ہوں تو وہ پتھر کی ایک مورتی رہ جاتی ہے۔" منٹو کا افسانہ "خالی ڈبے خالی بوتلیں" منٹو کے محبت سے وابستہ لاشعوری تصورات و محسوسات کی ایک علامتی پیش کش ہے۔ جس کے فہم وادراک سے منٹو خود قاصر رہا تھا۔ "یہ حیرت مجھے اب بھی ہے کہ خاص کر خالی ڈبوں سے مجرد مردوں کو اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے۔" مجرد مردوں سے میری مُراد اُن مردوں سے ہے جن کو عام طور پر شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔" (خالی بوتلیں خالی

ڈبے کباڑیوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو نے جب انہیں رام سروپ کے گھر سے نکلتے دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جس کی ناخوشگواری کا منٹو نے اس طرح اظہار کیا "۔ آپ یقین مانیے ان کو جدا ہوتے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں ایک عجیب قسم کا درد محسوس کیا" (خالی بوتلیں خالی ڈبے) شعوری طور پر منٹو کو رام سروپ کے اس خبط پر سخت حیرت تھی۔ ان کی علیحدگی پر منٹو کا ناقابل فہم (عجیب قسم کا) تکلیف دہ احساس، منٹو کے اندر عورت کے ساتھ جنسی تعلق پر داخلی روک کی چغلی کھا رہا ہے۔ ازدواجی تعلق کی نسبت اُس کے تصور میں انقلاب پیدا ہونے کے باوجود، رام سروپ نے شادی کے لیے ایک ایسی عورت کا انتخاب کیا جس سے منٹو کے خیال میں کسی بھی ہوشمند نوجوان کو عشق نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اس قدر بے جان تھی کہ دق کی مریض معلوم ہوتی تھی" (خالی بوتلیں خالی ڈبے)۔ رام سروپ جب شیلا کو اپنی دھرم پتنی کی حیثیت سے منٹو سے ملانے اس کے گھر آیا تو منٹو کو اس قدر تعجب ہوا کہ اگر وہ "وہسکی کے چار پگ نہ پیے ہوتا تو یقیناً یہ سن کر بے ہوش ہو گیا ہوتا"۔ رام سروپ کے جانے کے بعد منٹو دیر تک سوچتا رہا کہ بنارسی ساری میں شیلا کس کے مشابہ تھی؟"۔ "ایک دم"۔ منٹو کی آنکھوں کے سامنے ایک خالی بوتل آ گئی، باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی"۔ منٹو کا یہ بیان اس کے لاشعور کی ایک اضطراری آواز ہے۔ لیکن اس کا مفہوم ہمارے لیے صاف ہے۔ شیلا وہ بوتل تھی جو خالی رہ کر ماں کی قائم مقام رہ سکتی تھی۔ منٹو کے اس سوال کا جواب کہ "شیلا کس سے مشابہ تھی؟" ہم، بغیر ذہن پر زور دیئے دے سکتے ہیں: "ماں" سے۔

رام سروپ کی شخصیت منٹو کی اپنی شخصیت کا چربہ ہے۔ جیسا ہم سطور بالا میں کہہ چکے ہیں، منٹو کے اندر بھی عورت سے جنسی تعلق رکھنے پر ایک شدید لاشعوری روک لگی ہوئی تھی۔ فلمی دنیا کی اشتعال انگیز اور جنسی بے راہ روی کی مسموم فضا میں اپنے عنفوان شباب کے چار سال مجردانہ گزار کر بھی منٹو ہر طرح کی جنسی آلائشوں سے پاک رہا تھا شادی کے بعد بھی اس ماحول کی گندگی سے اُس کا دامن آلودہ نہ ہوا تھا۔ کی مثالی ازدواجی زندگی اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ صفیہ کے لیے منٹو کے دل میں وہی احترام تھا، اُس کی دلجوئی اور دلداری کی اُسے ویسی ہی فکر تھی جیسی بیٹے کو ماں کے لیے ہوتی ہے۔ عصمت جب اُس کی صفیہ سے محبت کا ذکر چھیڑتی ہے تو یہ بات منٹو کو اتنی ہی بُری لگتی ہے اور اس کا ردعمل ویسا ہی شدید ہوتا ہے جیسے کسی کو ماں کی گالی دی جائے (منٹو میرا دوست میرا دشمن)۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہر وہ ظرف جس میں کوئی چیز رکھی جا سکے (Container) رحم (Womb) کی ایک مستقل علامت بن کر خواب میں پیش ہوتا ہے۔ اس ظرف میں کسی چیز کو رکھنے کا فعل مباشرت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس کو خالی رکھنے کا علامتی مفہوم رحم کی تخم ریزی سے اجتناب ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو خالی ظروف، جیسے خالی بوتلیں یا خالی ڈبے جمع کرنے کی لت ہوتی ہے وہ مباشرت کے فعل کو لاشعوری طور پر ماں کے تصوّر سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجردانہ زندگی پر قناعت کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے لیے امتناع تزویج محرکات (Incest barrier) کا اطلاق جنس مخالف کے ہر فرد پر ہوتا ہے خواہ اس سے خونی لگاؤ ہو یا نہیں۔ ان کے لاشعور میں عورت کا تصوّر ماں کے تصور میں مدغم ہوتا ہے۔ ان کا لاشعور ان کے درمیان فرق کی تمیز پر قفل ڈال دیتا ہے۔ ان کی نگاہ میں ماں کی طرح ہر عورت محترم بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے باپ بننے کا فطری تقاضہ پالتو جانوروں سے اُن کا جذباتی تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ اکثر لاولد لوگوں کو جانور پالنے کا شوق ہوتا ہے جو کبھی کبھی ایک مرض کی حد تک شدید ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جن کے اندر کسی عورت سے جنسی تعلق پیدا کرنے پر داخلی روک لگی ہوتی ہے اکثر کتا، بلی اور دوسرے پالتو جانوروں سے اپنا گھر آباد کیے رہتے ہیں۔ عورت کے جسمانی لمس سے اجتناب کرتے ہوئے بھی وہ مرد ہونے کے ناتے پالتو جانوروں کے لیے اپنی پدری شفقت کو وقف کر دیتے ہیں اور اس طرح اپنا فرض منصبی ادا کر لیتے ہیں۔ رام سروپ کا کتا 'اسٹالن' جب بیمار پڑا تو اُس نے اُس کے علاج پر بے دریغ خرچ کیا۔ اس کے جانبر نہ ہونے پر رام سروپ اسی شدت کے ساتھ غم واندوہ میں مبتلا ہو گیا جس کی مثال باپ کے اندر اپنی اولاد کی موت پر ملتی ہے۔ کتے کی موت سے اس کے جذبہ پدری کو ٹھیس (Frustration) لگی تو باقی دوسرے پالتو جانوروں کے ساتھ بھی اس کی محبت کی گرمی پر اوس پڑ گئی۔ رفتہ رفتہ اُس نے ان سب سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اُس فطری منصب کے مطالبے نے جس کی متبادل تسکین سے بھی وہ محروم ہو چکا تھا اُسے پھر اُکسانا شروع کر دیا۔ اس کی شخصیت میں دفعتاً تبدیلی رونما ہو گئی۔ وہ رم کے بدلے وہسکی پینے لگا۔ منٹو نے اس کی تازہ فلم میں "اُس کے کردار میں ایک نئی تازگی دیکھی" (خالی بوتلیں خالی ڈبے)۔ ازدواجی زندگی سے اکراہ قبولیت میں تبدیل ہو گیا۔ خالی بوتلیں اور ڈبوں کی کشش بے معنی ہو گئی۔ رام سروپ نے ان کے

منٹو کے بعض افسانوں میں عورت کے سینے کی اشتعال انگیز تصویر کشی

جن افسانوں میں منٹو نے واحد متکلم کا استعمال نہیں کیا ہے، یعنی جن کا پس منظر اس کے وجود سے خالی ہے، ان میں اکثر افسانے عورت کے سینے کے پہلودار اور اشتعال انگیز بیانات سے قاری کو دعوت تلذذ پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے ایسے اقتباسات سطور بالا میں من وعن نقل کر دیئے گئے ہیں۔ ماں کا سینہ بچے کی توجہ کا اولین مرکز ہوتا ہے۔ بچہ اس سے اپنی غذائی حاجت بھی پوری کرتا ہے اور اپنے لبوں کو اس سے آشنا کر کے نفسیاتی لذت و آسودگی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ بچے کی نازک انگلیاں اور ہتھیلی بھی ماں کے سینوں کے ساتھ خوش فعلی میں مصروف رہ کر اسے مسرت و تسکین بخشتی ہیں۔ یہ سلسلہ عموماً دو ڈھائی برس تک چلتا ہے۔ اس کے بعد بچے کو ترک شیر خواری (Weaning) کی تربیت دی جانے لگتی ہے۔ ماں کے سینے سے بے واسطگی بچے کو بہت شاق گزرتی ہے۔ ماں کی آغوش سے علیحدگی اور اپنے محبوب مشغلے سے محرومی بچے کے لیے نفسیاتی نامرادی (Frustration) کا پہلا اور اس اعتبار سے نہایت جانگداز تجربہ ہوتا ہے۔ یہ اسے بہت مضطرب بنا دیتا ہے۔ بچہ ماں کی گود کے لیے ضد کرنے لگتا ہے۔ جب ماں اسے گود میں اٹھانے سے انکار کرتی ہے تو بچہ رونے، بپھرنے لگتا ہے۔ اس وقت اگر بچے پر زور زبردستی کی جاتی ہے اور خصوصاً اگر اس کی ضد ہٹ پر اسے ڈانٹ ڈپٹ، مار دھاڑ، نصیب ہوتی ہے تو ماں کے سینے سے بچے کی دلچسپی اور ماں کی آغوش کی کشش رفتہ رفتہ اپنا وجود کھو دینے کے بجائے اسی شدت کے ساتھ بچے کے لاشعور میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ اگر والدین کی نسبت لڑکے کے تصورات و احساسات کی قلب ماہیت نہیں پاتی تو یہ دلچسپی سن بلوغ تک پہنچنے

کے بعد بھی لاشعور میں اپنی جگہ بنائے رہتی ہے۔ معاشرے کی اخلاقی تربیت اور دباؤ اس کے شعوری اظہار میں مانع ہوتا ہے۔

منٹو کے والد کی سخت گیری اور ان کے مزاج کی درشتی کا اندازہ قاری کو منٹو کے خاندانی حالات کے مطالعے سے ہو چکا ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ ترک شیر خوارگی کے دھچکے (weaning Trauma) کی تلخی منٹو کے لیے غیر معمولی طور پر جانگسل ثابت ہوئی ہوگی۔ ماں کے سینے سے چمٹے رہنے کی آرزو نے لاشعوری طور پر اس کا پیچھا نہ چھوڑا ہوگا۔ ہم یہ خیال قائم کر چکے ہیں کہ منٹو کے لیے ماں کی محبت کی نوعیت غیر عورتوں کے ساتھ جنسی تعلق کے تصور سے جداگانہ نہیں رہی ہوگی۔ منٹو کے لیے ہر عورت ماں کی قائم مقام رہی ہوگی۔ اس صورت میں کسی عورت کے سینے کو بے نقاب کرنے کی خواہش ماں سے وابستہ پاکیزہ، نرم و نازک شعوری جذبات پر پانی پھیر دیتی اور شرم و گناہ کا احساس عزت نفس کے وجود کو پارہ پارہ کرنے کا باعث ہوتا۔ لیکن خواب کے قالب میں یا ادبی تخلیقات کے پیکر میں اس لاشعوری میلان کا علامتی اظہار عزت نفس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔ یہی سبب ہے کہ منٹو کی فحش نگاری انہیں افسانوں میں اپنے نقطہ عروج پر پہنچتی ہے جن میں وہ واحد متکلم کا استعمال نہیں کرتا۔ جن کہانیوں میں منٹو اپنے آپ کو بھی پیش کرتا ہے وہاں اس کے قلم کی بے باکی اور عریاں نگاری پر زبردست روک لگ جاتی ہے۔ وہ سارے افسانے دھواں، بو، کالی شلوار، اور ٹھنڈا گوشت جن کی وجہ سے عریانی اور فحش نگاری کے الزامات میں منٹو پر مقدمے چلائے گئے تھے۔ ان میں کسی افسانے میں بھی منٹو نے واحد متکلم کا استعمال نہیں کیا ہے۔ اسی طرح جن افسانوں کے اقتباسات راقم نے سطور بالا میں منٹو کی فحش نگاری اور خصوصاً عورت کے سینے کی مرقع کشی کی مثال میں پیش کیے ہیں ان میں سے کسی میں بھی منٹو نے دوسرے کرداروں کی صف میں اپنے کو کھڑا نہیں کیا ہے۔

منٹو کی فحش نگاری، عورت کے سینے کا بعض افسانوں میں تفصیلی بیان، منٹو کے لاشعور کا کرشمہ ہے۔ وہ انہیں محض اضطراری طور پر، بلا سوچے سمجھے، اپنے افسانوں کی زینت بناتا ہے۔ منٹو کے تخلیقی کارناموں کا بے ساختہ پن، بغیر کسی ذہنی کاوش کے، مشینی رفتار سے اس کی تخلیقات کی صفحہ قرطاس پر نمود، ان کے لاشعوری ماخذ کی گواہی

دیتا ہے۔ منٹو کے جینیئس ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ جینیئس کی تخلیقات کا سوتا اس کے لاشعور میں ہی پھوٹتا رہتا ہے۔ اس کا شعور صرف انہیں الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ بقول غالبؔ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالبؔ نے غیب کو جس معنی میں استعمال کیا ہے اسے ہم لاشعور کا مترادف باور کر سکتے ہیں۔ غیب کی آواز نوائے سروش بن کر فنکار کے شعور کو چوکنا کر دیتی ہے۔ اسے قلمبند کرنے کے لیے فنکار شعوری طور پر سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ تخلیقی ساعتوں میں منٹو کا طریقِ نشست ویسا ہی ہوا کرتا تھا جیسے جنین شکم مادر میں رہتا ہے۔ وہ کرسی پر پاؤں اوپر کیے گھٹنوں کو بانہوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا کرتا تھا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منٹو کی تخلیقات کا منبع اس کا لاشعور تھا۔ شکم مادر میں جنین کے دماغ کا سارا مواد نسلی ورثہ پر مشتمل سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی حیثیت لازماً لاشعوری ہوگی۔ شعور کی کارفرمائی اس وقت شروع ہوتی ہے جب خارجی ماحول کے اثرات کا ردّعمل شعور کی سطح پر ہونے لگتا ہے۔ منٹو کی یہ نرالی نشست اس کے ذہن کو لاشعور کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کے لیے مستعد کر دیتی ہوگی۔

مندرجہ بالا توضیح و تجزیہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ منٹو کی تخلیقات اس کی شخصیت اور کردار کی جو تصویر ہمارے سامنے کھڑی کرتی ہیں اس میں اس کیفیت کی پوری ترجمانی ہوتی ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں (Mother fixation) مادر وابستگی کہا گیا ہے۔ اس اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ بچے کی نفسی جنسی (psycho sexual) توانائی (energy) کا معتدبہ حصہ، بچپن سے بلوغیت کے سفر کی اس ابتدائی منزل میں اٹک (fixate) جاتا ہے جب ماں بچے کی مادی تسکین و لذت یابی کا تنہا وسیلہ ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت ضروری ہے کہ نفسیات کی اصطلاح میں جنس کا اطلاق صرف سن بلوغ کے جنسی میلان اور اس کے اظہار پر نہیں ہوتا۔ ہر وہ فعل جو مادی لذت یابی کا وسیلہ ہو سکتا ہے جنس سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ اس وسیع مفہوم کے مطابق ہم جنس کو نفس امارہ کے مترادف سمجھ سکتے ہیں یعنی ان سارے میلانات کا سرچشمہ جن کا ماحصل جسمانی

مادی تسکین ہوتی ہے۔ غیر عورتوں کے ساتھ منٹو کی سرد مہری، جنسی بے راہ روی اور بے عنانی سے تنفر، محبت کو شہوت سے الگ نہ کر سکنے پر اس کی سراسیمگی، فلمی دنیا کے رومان پرور ماحول میں جوانی کے دن جنسی آلائشوں سے پاک رہ کر گذارنے کا غیر معمولی کارنامہ، عورتوں کی اشتعال انگیز عریانی، بے شرمی اور بے حیائی کا اس کی نگاہوں میں چبھنا، ان افسانوں میں جن میں وہ واحد متکلم کا استعمال کرتا ہے اس میں قلم کی بیباکی اور فحش نگاری پر روک اور جن افسانوں میں منٹو خود کو پیش نہیں کرتا ان میں فحاشی اور عریانی کو کھلی چھوٹ، ان شخصیتوں سے پیار جو عورتوں کو اپنے پاس مٹھکنے نہیں دیتے۔ ان ساری گتھیوں کی گرہیں منٹو کی مادر وابستگی (Mother fixation) کی روشنی میں کھل جاتی ہیں

منٹو کی مادر وابستگی اس کے ایغو کی ناتوانی کی ذمہ دار تھی۔ نفسی جنسی توانائی (Psycho sexual energy) کا پورا فطری سرمایہ، بلوغیت کی منزل پر پہنچکر منٹو کے قبضے میں نہیں رہا تھا۔ بہت کچھ ابتدائی منزلوں میں اٹک کر پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ منٹو کی وہ تخلیقات جنہیں اس کا لاشعور اس کے تیز خرام قلم کے سپرد کرتا رہتا تھا اس پسماندہ توانائی کا کرشمہ تھیں۔ لاشعور کے تقاضوں کی کامل جانچ پڑتال اور ان کے اظہار پر کڑی پابندی منٹو کے ایغو کے بس سے باہر تھی۔ لاشعور سے مغلوب ہو کر وہ تخلیقی سطح پر ان لغزشوں کا مرتکب ہو جاتا تھا جن کے لیے اسے فوق انا کی تعزیرات برداشت کرنا ہوتی تھی۔ اس کے ایغو کی ناتوانی فوق انا کی مدافعت کا بھی اسے یارانہ دیتی تھی۔ فوق انا کی ملامتوں کے تیز نشتر سے گھائل ہو کر وہ عجب اضطراب، احساس کمتری، ناتمامی اور عدم تکمیل کا شکار ہو جاتا تھا۔ اعتماد و یقین کا اس کے پاس گذر نہیں تھا۔ وہ شکوک کے گھروندے میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا تھا۔ اسے ہر شے میں ایک کمی محسوس ہوتی تھی۔ اپنے کو جسمانی اور روحانی طور پر علیل محسوس کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اسے جو کرنا چاہیے کر نہیں پاتا اور جو نہ کرنا چاہیے وہی کر رہا تھا، وہ ایک سخت ذہنی کرب و عذاب میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ منٹو کی تلون مزاجی، چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر لے کر ایک ملازمت کو چھوڑ کر دوسری ملازمت پکڑنی اس کی داخلی نا آسودگی کا نتیجہ تھی۔ عزت نفس کا شدید احساس اس کی غیر معمولی ذکی الحسی، اپنی اہانت اور شکست پر آتش زیر پا ہو جانا، منٹو کے فوق انا کی اس کڑی نگرانی اور تعزیر کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اپنے احساس کمتری پر پردہ ڈالنے کی کوشش سے

وہ باز نہیں آتا تھا اور ہر موقع پر اس کے ازالے کے لیے دوسروں کی توجہ اور قدر شناسی کا مرکز بنا رہنا چاہتا تھا۔ منٹو کے مزاج کی یہ ساری خصوصیتیں اس کے تند و تیز کار فوق انا کے آگے اس کے ناتوان الیغو کی پسپائی کی علامتیں ہیں۔ منٹو کی نفاست پسندی، صفائی ستھرائی بھی اس کے الیغو کا فوق انا کے حضور میں ان آلائشوں اور گندگیوں سے پاک رہ کر پیش ہونے کی کوشش کا علامتی اظہار تھا۔ جن میں ملوث ہو کر وہ اپنے لاشعوری میلانات کے تقاضے پورا کر سکتا تھا۔ منٹو کے افسانے 'بو' میں 'رندھیر نے، جو صفائی ستھرائی کا عادی تھا "کتنی بار اس گھاٹن لڑکی کے بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی بلکہ عجیب قسم کی تسکین کا احساس ہوا"۔ رندھیر کا یہ مکروہ فعل اس کے لاشعور کی کامل تسلیط کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اپنی کثرتِ شراب نوشی کا ڈھنڈورا

اپنے خیال میں منٹو ضمیر کے تند و تیز نشتر کے خوف سے شراب کی مدہوشی میں پناہ لیتا تھا۔ سعید قریشی، اس کا بچپن کا دوست، جب آخری بار منٹو سے ملا تو اس سے پہلے کہ سعید قریشی اس سے کچھ کہتا، منٹو جس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا، بول اُٹھا: "تو بھی ناصح بن گیا۔ اس کمبخت سے بھاگ کر تو میں نے یہاں پناہ لی تھی۔ تجھ سے بہتر سلوک کی توقع تھی۔" (رحم دل، دہشت پسند) اپنے ایک مضمون میں جس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے، منٹو نے مدہوش بنانے والی چیزوں کے متعلق ایسا ہی تصور پیش کیا ہے۔ یعنی وہ انسان کے ضمیر کو کند کر دیتی ہیں۔ منٹو کا بیان ہے:۔ "لوگ وقتی طور پر اداسی دور کرنے کے لیے یا فرحت حاصل کرنے کے لیے شراب نہیں پیتے اور نہ وہ اس لیے پیتے ہیں کہ مدہوشی گوارا شے ہے بلکہ اپنے اندر اپنے ضمیر کی آواز غرق کرنے کے لیے پیتے ہیں۔" اسی مضمون میں منٹو ایک دوسری جگہ کہتا ہے "لوگ جس قدر زیادہ منشیات کو استعمال کریں گے اسی قدر وہ اخلاقی طور پر غیر حساس ہوتے چلے جائیں گے۔ لوگ ان اشیا کو یا تو اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ شرم کے ان احساسات کو دبا دیں جو کسی غلط کام کے کرنے پر پیدا ہوتے ہیں یا پہلے سے خود پر ایسی حالت طاری کر دیں جس میں وہ ضمیر کے خلاف کام کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے حیوانی وجود کی اطاعت کر سکتے ہیں۔" (منٹو کے ادبی مضامین) منٹو نے ایک مبہم عبارت میں 'ضمیر' اور اس سے وابستہ 'شرم کے احساسات' اور 'حیوانی وجود' جیسے الفاظ کا استعمال کر کے انسانی شخصیت کے متعلق اپنی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ ان میں شخصیت کے ان پہلوؤں

کی جھلک ملتی ہے جنہیں ہم نے اڈ، لبڈو اور فوق انا کہا ہے۔

حقیقت میں منٹو کی کثرت مے نوشی صرف اس کے ضمیر کی آواز یعنی فوق انا کے امتناعی اور تادیبی ارشادات واحکامات کی نیش زنی کو کند کرنے کا وسیلہ نہیں تھی۔ منٹو اپنے رند بلانوش ہونے کا ڈنکا پیٹتا رہتا تھا۔ اس کا بار بار ذکر کرنے سے وہ کبھی باز نہیں آتا تھا۔ اس طرح مے نوشی پر اخلاقی پابندی کی خلاف ورزی کر کے وہ غیر اخلاقی حیوانی تقاضوں کی پاسداری کا ثبوت پیش کرتا تھا۔ اس کے جلو میں اس کی جنسی پاکبازی غیر عورت کے جسمانی لمس سے اجتناب، صفائی ستھرائی پر اصرار، اس کی شراب نوشی سے برانگیختہ فوق انا کے حضور میں اس کی صفائی کا وسیلہ بن جاتا تھا۔ منٹو کی غیر معمولی پارسائی اور اخلاقی پاکیزگی ایک آقا کو راضی کر کے دوسرے آقا کی ناراضگی اور عتاب سے بچنے کی تدبیریں تھیں۔ دو متضاد اور متصادم تقاضوں کے جال میں پھنس کر منٹو جس ذہنی کشمکش کا شکار تھا اس کی عکاسی اس کے افسانے "ڈرپوک" میں ہوتی ہے۔ جاوید جو اپنے فطری جنسی تقاضوں کو تہذیب واخلاق سے آراستہ وسیلوں کے ذریعے پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچا سکا تھا اپنے اوپر حیوانی جذبات طاری کر لیتا ہے۔ وہ مائی جیوان کے گندگی اور غلاظت سے لبریز قحبہ خانے کا رُخ کرتا ہے۔ "وہ خود کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس طور پر کہ ایک عرصہ تک اس کے خوبصورت خیال جن کو اس نے اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجائے رکھا تھا غلاظت میں لتھڑائے رہیں۔" جاوید آپ ہی آپ یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا "مجھے نفاست تلاش کرنے میں ناکامی رہی لیکن غلاظت تو میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اب جی چاہتا ہے کہ اپنی روح اور اپنے جسم کے ہر ذرے کو اس غلاظت سے آلودہ کر دوں۔ میری ناک جو اس سے پہلے خوشبوؤں کی متجسس رہی ہے اب بدبو اور متعفن چیز سونگھنے کے لیے بیتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنے پرانے خیالات کا چوغہ اتار کر اس محلے کا رخ کیا ہے جہاں ہر شے ایک پُراسرار تعفن میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔" جاوید کی نگاہ دفعتاً میونسپلٹی کی لالٹین کی طرف جاتی ہے جو اُسے گھورتی ہوئی نظر آتی ہے جیسے وہ اس کے ارادے پر پانی پھیر کر اس کے رستے میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "اس کی زندگی کی ستائیس برسوں کی جھجک جو اسے ورثہ میں ملی تھی اس لالٹین میں مسخ ہوگئی ہے۔ یہ جھجک جس کو پرانی کینچلی کی طرح وہ اتار

کر گھر چھوڑ آیا تھا اس سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی جہاں اسے اپنی زندگی کا سب سے بھدا کھیل کھیلنا تھا۔ ایسا کھیل، جو اسے کیچڑ میں لت پت کر دے۔ اس کی روح کو ملوث کر دے۔" لالٹین کا کھمبا فوق انا کا وہ روشن مینار تھا جس کی روشنی جاوید کے قدموں کی بیڑی بن کر اس تاریک گڑھے میں گرنے سے، اس قعر مذلت کی عمیق گہرائی میں اپنا وجود کھونے سے روک رہی تھی جس کا عزم کر کے وہ گھر سے "تہذیب و تمدن کے صندوق میں تالا لگا کر" نکلا تھا۔" جاوید بے چین ہو گیا۔ ایک الجھن سی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی۔ ارادہ اس کے اندر اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ اگر پہاڑ بھی اس کے راستے میں ہوتے تو وہ ان سے بھڑ جاتا۔ لیکن میونسپل کمیٹی کی اندھی لالٹین جس کو ہوا کا ایک جھونکا بجھا سکتا تھا اس کی راہ میں بری طرح حائل ہو گئی تھی۔" ذہنی کشمکش، حیوانی ترغیبات اور تہذیبی اور اخلاقی میلانات کی جنگ کا یہ فنکارانہ بیان اس داخلی کشمکش کا مرقع ہے جس کے شکنجے میں منٹو کا نحیف و زار الیغو ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ وہ کبھی اپنی ذات کو لاشعوری حیوانی تقاضوں کے بہاؤ پر چھوڑ دینے کا عزم کرتا تھا اور کبھی اپنے تند و ترش فوق انا کی من مانیوں اور جبر و استبداد کے آگے سر تسلیم خم کر کے اپنے عزت نفس کے صاف ستھرے لبادے کو ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک رکھنے کی فکر میں غلطاں ہو جاتا تھا۔ جاوید اپنے آپ سے سوال کرتا ہے "تم ... تم.... تم کیا ہو..... میں پوچھتا ہوں آخر تم ہو کیا، نہ تم یہ ہو...... نہ تم وہ ہو...... نہ تم انسان ہو نہ حیوان۔" جاوید کی یہ خود کلامی منٹو کی ذہنی چپقلش اور داخلی کشمکش کی غمازی کر رہی ہے۔ جاوید کا یہ احساس کہ " اس کے وجود میں ایک جھجک بیٹھی ہوئی ہے جس نے اسے قابل رحم اور ڈرپوک بنا دیا ہے۔" منٹو کے الیغو کی ناتوانی، یقین و اعتماد کا فقدان اور شک و گمان کی قید و بند میں بے دست و پائی کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اپنی نفاست طبع کو ہائی جوان کے قحبہ خانے کے ارد گرد کی غلاظت اور تعفن سے آلودہ کرنے کا ارادہ جاوید کی کڑی، بے لوچ، غیر متوازن اور اٹل قدروں کے آگے سپر انداز ہو جاتا ہے۔" جاوید کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا تو اس کی پیٹھ پر دم اگ آئے گی جو ویشیا کے پچکارنے پر ہلنا شروع کر دے گی۔" جاوید بھاگ کھڑا ہوا۔ جب وہ گھر کے قریب آیا تو " اس کے خیالات کے ہجوم میں سے، دفعتاً ایک خیال رینگ کر آگے بڑھا" اسے خدا کا شکر بجا لانا چاہیے۔ وہ ایک بڑے گناہ سے " بچ گیا تھا۔

منٹو کی ذہنی کشمکش پر روشنی ڈالنے اور رند بلا نوش ہونے کے باوجود جنسی آلائشوں سے اپنا دامن بچائے رہنے کی توجیہ کے لیے راقم نے منٹو کے اس افسانے سے پوری طرح فائدہ اٹھایا ہے۔ اس افسانے کی خصوصی اہمیت کے مدنظر مجھے امید ہے کہ قاری کو سطور بالا کی طوالت گراں نہ گزرے گی۔ بلکہ میں قاری کی توجہ اس افسانے کی ان تفصیلات کی طرف مبذول کرنی چاہوں گا جن میں افسانے کے ان اقتباسات کو یک جا کر دیا گیا ہے جن سے منٹو کی داخلی رسا کشی کی علامتی نشاندہی ہوتی ہے۔

ان حیوانی رجحانات کا سراغ جو منٹو کی لاشعوری ذات کو اپنا کھلونا بنائے ہوئے تھے، رندھیر کی کلیدی شخصیت میں ملتا ہے۔ رندھیر منٹو کے افسانے 'بو' کا مرکزی کردار ہے۔ گھاٹن لڑکی کے گندے جسم سے جو بو نکل رہی تھی، رندھیر کے لیے اس معطر خوشبو سے کہیں زیادہ خوش آئند اور تسکین آفرین تھی جو اس کی نئی نویلی زرین پوشاک میں ملبوس دلہن کے گورے چٹے بدن سے نکل رہی تھی۔ "اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے اڑتی ہوئی بو" رندھیر کے دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ رہی تھی۔ اس کے تمام نئے پرانے احساسات میں رچ گئی تھی۔" اس بو کا تعلق نیم وحشی انسان کی زندگی کے اس دور سے تھا جس کے نقوش رندھیر کے لاشعور میں محفوظ تھے۔ "رندھیر کو ایسا لگا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے۔ اس کے معنی سمجھتا ہے۔ لیکن کسی کو سمجھا نہیں سکتا۔" لاشعور کی گرفت نے موجودہ تہذیب وتمدن سے آراستہ گوری چٹی لڑکی کے جسم سے نکلی ہوئی عطر بیز خوشبو میں ایک "عجیب قسم کی کھٹاس پیدا کر دی جیسی بدہضمی کی ڈھکار میں ہوتی ہے۔" "اس میں وہ آواز کہاں تھی، وہ پکار جو اس گھاٹن لڑکی کے بدن میں سونگھی تھی۔ وہ آواز جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے زیادہ مسرور کن تھی۔ وہ جو حلقہ خواب سے نکل کر بے آواز ہوگئی تھی۔" اپنی اس تخلیق میں منٹو نے غیر ارادی طور پر کمال بیباکی کے ساتھ اپنے اوپر لاشعور کے تقاضوں کی عملداری کا راز فاش کر دیا ہے۔ حلقہ خواب سے نکلنے والی آواز لاشعور کی وہ صدائے خوشی ہے جس کی بے آوازی کی پناہ میں الیغو فوق انا کے قہر وعتاب سے مامون رہتے ہوئے لاشعوری مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کر دینے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ منٹو کے افسانے 'ڈرپوک' کی طرح، راقم اپنے قارئین کو اس کے افسانے 'بو' کے ان اقتباسات پر نگاہ ڈالنے کی دعوت دیتا ہے جنہیں سطور بالا میں 'منٹو کے افسانوں کے کلیدی کردار' کے باب میں قلمبند کر دیا گیا ہے۔

اپنے افسانوں کے بعض کرداروں سے مماثلت

سطور بالا میں منٹو کے افسانوں کے سات مرکزی کردار کی حیثیت کلیدی قرار دی گئی ہے۔ ان سے ہمیں منٹو کی شخصیت کے فہم میں مدد ملتی ہے۔ جاوید، رام سروپ اور رندھیر کی ذات منٹو کی ذہنی کشمکش، اس کا لاشعوری جنسی میلان اور جنسی تعلق سے عملاً اجتناب کی جس طرح عکاسی کرتی ہے اس کی تفصیل قاری کی نظروں سے گزر چکی ہے۔ اسی طرح باقی چار کردار بابو گوپی ناتھ، سہائے، ممد بھائی اور وودا پہلوان کی ذات بھی منٹو کی شخصیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے اندر بھی نیکی و بدی، اچھائی اور برائی کے امتزاج کا وہی نقش نظر آتا ہے جو منٹو کی اپنی شخصیت کی خصوصیت تھا۔ یہ چاروں ہمارے معاشرے کے وہ افراد ہیں جنہیں عام طور پر نیچی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ منٹو ان کے ایسے اوصاف کو نمایاں کرتا ہے جن کا شمار انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں میں کیا جاتا ہے۔ **بابو گوپی ناتھ** عیاش طبع، رنڈیوں کے کوٹھوں کا شیدائی، شراب و کباب کی رنگ رلیوں کا رسیا، اپنے باپ کی کمائی ہوئی دولت پانی کی طرح بہا رہا تھا لیکن ان ساری آلودگیوں سے وابستگی کے باوجود اس کا خلوص، دریا دلی، ان چند غرض مندوں کے ساتھ جنہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اسے بے وقوف بنا رہے تھے اس کا تحمل و بردباری، عاجزی اور انکساری، اس کے اعتقادات کی پختگی، یہ سارے اوصاف اس کی شریف النفسی اور علو ظرفی کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ وہ انسانیت کے درد سے دھڑکنے والا دل رکھتا تھا۔ وہ کبھی بھی یہ نہیں سوچتا تھا کہ زینت کی جوانی کی بہاریں لوٹ کر اسے اپنے جسم کا سودا کرنے کے لیے ویشیاؤں کے جھرمٹ میں بے دست و پا چھوڑ دے اور اپنی دولت ختم ہو جانے پر بازارِ حسن سے منہ موڑ لے۔ زینت کے لیے ایک

روشن مستقبل کی اسے اسی لگن کے ساتھ تلاش تھی جیسی ایک فرض شناس باپ کو اپنی دختر کی زندگی سنوارنے کی ہوتی ہے۔ کسی شریف زادے سے زینت کی شادی کر دینے کی فکر اسے دامنگیر تھی۔ اس سلسلے میں اس نے کتنوں کی جانچ پڑتال کی جو زینت کو شریک زندگی بنانے کے آرزومند تھے اور آخر میں ایک ایسے متمول خاندان کے رئیس زادے کا انتخاب کیا جس کی وفاداری اور حسن سلوک پر اسے کامل اعتماد تھا۔ اس نے زینت کی شادی پر جی کھول کر خرچ کیا۔ سہاگ بھڑوا تھا، لڑکیوں کا دلال، جوان لڑکیوں کے جسم کی سودہ بازی جیسے شرمناک پیشے کی کمائی سے اس نے دو سال کے اندر بیس ہزار روپے جمع کر لیے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی نفاست پسندی، گاہکوں کے ساتھ دیانت داری، ان لڑکیوں کی فلاح و بہبود کی فکر، ان کے ایک ایک پیسے کا حساب رکھنا اور ڈاکخانے میں جمع کر دینا سلطانہ کی امانت واپس کرنے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دینا۔ یہ سب ایسی نیکیاں تھیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ **ممد بھائی** اپنے علاقے کا دادا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ کتنوں کا خون کر چکا تھا۔ اس کی مہیب نوکیلی مونچھیں دیکھ کر لوگوں کے اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ لیکن علاقے کی بیوہ، بے کس عورتوں اور مصیبت زدہ نادار مردوں کی نگاہ میں ممد بھائی ایک فرشتہ رحمت تھا جس کی بخشش و کرم کی ارزانی دست سوال کی محتاج نہیں تھی۔ وہ علاقے کے سارے ضرورت مندوں کی اپنے کارندوں کے ذریعے خبر حاصل کر کے وقت پر بغیر ان کے منہ کھولے ان کی حاجت روائی کرتا تھا۔ اس نے صرف اپنی زبان رکھنے کے لیے اس نوجوان کا پیٹ چاک کر دیا تھا جس نے ایک بوڑھی عورت کی جوان بیٹی کی آبرو ریزی کی تھی۔ اس کا خمیازہ ممد بھائی کو شہر بدر ہو کر اٹھانا پڑا۔ **دودا پہلوان** شراب پیتا تھا، رنڈیوں کے کوٹھے پر رقص و سرود کی محفلوں میں شرکت کرتا تھا لیکن ایک اوباش طبع رئیس زادہ صلاحو کی خدمت گزاری وہ جس خلوص اور دیانتداری کے ساتھ کر رہا تھا، اس جیسے شخص کے لیے ایک عدیم المثال بات تھی۔ ودوا پہلوان کو اپنی لنگوٹ بندی کا ویسا ہی پاس تھا، وہ اس کی حفاظت اسی انہماک کے ساتھ کرتا رہا تھا جیسا ایک متقی اور پرہیزگار کو اپنی دینداری کا ہوتا ہے۔ لیکن جب صلاحو کے مکان کی قرقی ہو گئی جس کی خلاصی کے لیے دس ہزار روپیوں کی ضرورت تھی اور اس کی نیک سیرت بیوہ ماں اپنی اس ایک ہی بچی ہوئی ڈیوڑھی سے علیحدگی کے بھیانک خواب دیکھنے لگی تو ددوا کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی۔ اسے الماس

کے ہاتھ اپنی لنگوٹ بندی کا دس ہزار روپے کے عوض سودا کرنا پڑا۔ صلا حو کو یہ بات بتلا کر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

منٹو کی ذات اس کی آوارہ گردی، لاابالی پن اور خصوصاً "رندخراباتی" ہونے کی وجہ سے قابلِ ستائش نہیں تھی۔ اپنا پہلا طبع زاد افسانہ 'تماشہ' کی اشاعت کے بعد منٹو کی مسرت پر اس احساس سے اوس پڑجاتی ہے کہ "امرتسر کی نظروں میں ہم ویسے ہی آوارہ گرد ہیں۔ پان سگرٹ والے بدستور اپنے پیسوں کا تقاضہ کرتے اور خاندان کے بزرگ برابر اپنا وہی فیصلہ سناتے تھے کہ ہمارے لچھن اچھے نہیں ہیں۔" (باری صاحب) منٹو کے بھائی، سعید حسن بیرسٹر نے جس "تیز و تند لہجے میں" اس کے دوستوں کو "برا بھلا کہا تھا" اور جس کو سوچ کر منٹو کے "کان میں پگھلا ہوا سیسہ اُتر آتا تھا" (نور جہاں) اس سے منٹو کی ذات مستثنیٰ نہیں تھی۔ لیکن اپنے افسانوں کے کردار، بابو گوپی ناتھ، سہائے، ممد بھائی اور دودا پہلوان کی طرح منٹو بھی ایسے اوصاف کا مالک تھا جن کی اخلاقی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ منٹو کی جنسی پاکیزگی کا تفصیلی بیان ہم کر چکے ہیں۔ ادبی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنا لینے کے باوجود، منٹو انتہائی خلوص و دیانت داری کے ساتھ اپنے اوپر باری علیگ کے احسان کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اسے اس کا اعتراف ہے کہ اگر باری صاحب کی محبت اسے نصیب نہیں ہوتی تو وہ "ایک غیر معروف آدمی کی حیثیت سے مر کھپ گیا ہوتا۔" (باری صاحب) شیام نے منٹو پر جو احسانات کیے تھے ان کا بیان منٹو جس تفصیل کے ساتھ کرتا ہے اس سے اس کے جذبہ احسان شناسی کی شدت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک دفعہ شیام کو دس ہزار روپے مل گئے۔ یہ روپے اس نے منٹو کے ساتھ مل کر خرچ کیے۔ ایک بار اپنے پانچ سو روپوں میں سے شیام نے ڈھائی سو منٹو کی جیب میں رکھ دیئے۔ منٹو جب پاکستان میں مالی بدحالی کا شکار تھا، شیام نے کسی طرح اس کا پتہ معلوم کر کے پانچ سو روپے بھیج دیئے۔ (مرلی کی دھن) منٹو کی چراغ علی حسرت سے زندگی بھر نوک جھونک چلتی رہی۔ صحافت کے میدان میں دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ پاکستان میں بھی منٹو نے حسرت کا پیچھا نہ چھوڑا۔ لیکن جب منٹو پر 'ٹھنڈا گوشت' کے مقدمے میں تین سو روپے کا جرمانہ ہوگیا تو حسرت نے اپنی جو خدمت پیش کی اس کا منٹو نے پُرخلوص اعتراف کیا ہے۔ پاکستان میں سید شوکت حسین رضوی یا مکتبہ جدید لاہور کے چودھری برادران

منٹو کی مالی امداد کرتے رہتے تھے۔ اس کا ذکر بھی منٹو نے جذبہ احسان مندی کے پرتپاک اظہار کے ساتھ کیا ہے۔ زندگی بھر معاشی تنگی کا شکار رہنے کے باوجود، منٹو نے دوسروں پر خرچ کرنے میں اپنی مٹھی کھلی رکھی۔ احمد ندیم قاسمی جب دلی میں منٹو کا مہمان تھا تو منٹو نے صرف کافی جھگڑا کر کے آل انڈیا ریڈیو کے دفتر سے اس کے پیسے وصول نہیں کرا دیئے بلکہ چاندنی چوک لے جا کر اس کے لیے" پتلون اور کوٹ کے کپڑے خریدے"۔ (منٹو کی چند یادیں اور خطوط) میرا جی کا اپنے پیسوں سے شراب نہ خرید سکنے کا احساس کچھ دن تک منٹو سے روزانہ ساڑھے سات روپے اس کو دلواتا رہا۔ (تین گولے) رام کھلاون دھوبی کی سنگین علالت کے موقعہ پر منٹو اس کے علاج معالجہ کا خرچ اپنی جیب سے پورا کرتا رہا۔ شوکت حسین رضوی کے لیے منٹو جب ایک کہانی لکھ رہا تھا، شوکت کو ایک نئے کانٹریکٹ کے سلسلے میں تیس ہزار روپے پیشگی ملے۔ منٹو نے یہ ساری رقم شوکت سے لے کر رجسٹری اور بیمہ کر کے شوکت کے گھر بھیج دیئے اور شوکت کو مجبور کر کے دس ہزار کے لیے اس کی زندگی کا بیمہ کرا دیا۔ اپنے اس فعل پر منٹو کو تعجب تھا۔ "معلوم نہیں یہ سب کیوں کر رہا تھا، میں اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنی یہ تمام حرکت بزرگانہ ہونے کے بجائے طفلانہ معلوم ہوتی تھی۔ صاف اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ" (نور جہاں) یہ واقعہ منٹو کی دردمندی اور اور خلوص کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اپنے افسانوں کے ان چار کردار کے غیر معمولی اوصاف کو نمایاں کر کے، منٹو اپنی جمعیت خاطر کا سامان کرتا ہے جس طرح ان کے محاسن سے آشنائی، ان افسانوں کے قاری کے دل میں ان کی عظمت کا سکہ بٹھا دیتی ہے۔ اسی طرح منٹو کے پسندیدہ اطوار اس کی کثرت مے نوشی سے برافروختہ فوق انا کو متاثر کر کے اس کے غیض و غضب سے ایغو کو مامون کر لیں گے منٹو اپنے ضمیر کی پیش زنی سے بچ جائے گا! ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اپنے کرداروں کی خوبیوں کا بیان منٹو اس لیے نہیں کرتا کہ وہ ان سے متاثر ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے اندر منٹو کے اپنے محاسن کا عکس نظر آتا ہے جس سے اس کو تسکین و طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

منٹو کے ترقی پسندانہ افسانے

منٹو نے کچھ ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جنہیں ترقی پسندانہ کہا جاسکتا ہے۔ باری علیگ کی صحبت میں منٹو کو مطالعہ کا شوق پیدا ہوگیا تھا اور خصوصاً اشتراکی مکتب فکر کے مشاہیر کی تخلیقات سے اسے گہری دلچسپی ہوگئی تھی۔ اس سے ایک طرف اس کی ذہنی تربیت کا سامان ہوگیا اور غور وفکر کی صلاحیتیں پروان چڑھیں تو دوسری طرف سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھی اس کے اندر نمو پانے لگا تھا۔ ملک کے اندر آزادی کی لہر تیزی سے پھیل رہی تھی اور انگریزوں کا تختہ اُلٹنے کی لگن دن بہ دن زور پکڑتی جارہی تھی۔ ملک کی غلامی کو غربت، جہالت، بے روزگاری اور ساری دوسری اقتصادی اور اخلاقی گراوٹوں کا سبب قرار دیا جانے لگا تھا۔ منٹو بھی ان عصری تقاضوں سے متاثر ہوا اور اس نے چند ایسے افسانے بھی لکھے جن کا مقصد سیاسی اور سماجی بیداری کی اس لہر کو ہوا دے کر عوام کے دلوں میں بغاوت کے جذبات کو بھڑکانا تھا۔ ان میں نیا قانون، نعرہ، شغل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ نیا قانون کا کردار استاد منگو کوچوان نے اپنے گاہکوں سے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے بارے میں مختلف باتیں سُن رکھی تھیں۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس نئے قانون کے نفاذ کے بعد انگریز ملک سے نکال دیئے جائیں گے۔ ملک آزاد ہوجائے گا۔ غریبی اور بے روزگاری دور ہوجائے گی اور سرمایہ داروں کی نوچ کھسوٹ کا خاتمہ ہوجائے گا۔ نیا قانون کا نفاذ پہلی اپریل سے ہونے والا تھا۔ پہلی اپریل کو منگو صبح سویرے ہی ٹانگہ لے کر نکل گیا۔ ایک گورے سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ گورے نے جب حسب عادت اس سے بدکلامی کی تو منگو نے یہ کہتے ہوئے کہ "پہلی اپریل کو

بھی یہ اکڑ فوں ..... اب ہمارا راج ہے۔" گورے کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ پولیس اُستاد منگو کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔" وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہا۔" لیکن کسی نے ایک دسنی۔ نعرہ کا کردار کیشو لال کی مفلسی نے اسے اس قابل نہ رکھا تھا کہ وہ جس کھولی میں رہتا تھا اس کا کرایہ ہر ماہ پابندی سے ادا کر سکے۔ چنانچہ دو ماہ کا کرایہ باقی تھا کہ کھولی کے مالک نے تقاضہ شروع کر دیا اور جب کیشو لال نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا تو اسے ایسی گالی دی جو کیشو لال کے دل و دماغ میں سرایت کر گئی۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا لیکن وہ بے بس تھا۔ کرایہ دار کے ساتھ کچھ نہ کر سکا اور گھر سے نکل کر ایک ہوٹل کے سامنے اس نے بلند آواز سے نعرہ لگایا۔ پاس کھڑا ہوا ایک شخص بولا: "پگلا ہے"۔ "شغل" غریب لڑکیوں کے جنسی استحصال کی ایک داستان ہے۔ چند مزدور سڑک پر کام میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک موٹر کار آئی، ایک نوجوان اس کار سے اترا اور بھنو چمار کی لڑکی "رام دئی" کو موٹر پر بٹھا کر کہیں لے گیا۔ مزدوروں میں کھلبلی مچ گئی۔ جس پنڈت نے اس لڑکی کو موٹر پر بٹھایا تھا مزدوروں کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ نوجوان لڑکی کو سیر کرانے کے لیے لے گیا ہے۔ کچھ دیر میں اسے واپس بھیج دے گا۔" امیر آدمیوں کے ایسے ہی شغل ہوتے ہیں"۔ ان میں سے ایک مزدور یہ سن کر بول اٹھا: " اگر امیر آدمیوں کا یہی شغل ہے تو ہم غریبوں کا اللہ بیلی ہے۔"

ملک کی تقسیم کے حادثے نے جس بہیمانہ غارت گری اور خون ریزی کا مظاہرہ پیش کیا اس کی داستان ایک مدت تک افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنتی رہی۔ چنانچہ منٹو نے بھی اس سیاسی اور سماجی بحران کی حماقتوں اور مغالطوں کا پردہ فاش کیا ہے جس کی وجہ سے بھارت اور پاکستان شدید مالی اور جانی تباہی کے شکار ہوئے تھے۔ منٹو کا مشہور افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "موتری" ملک کی تقسیم پر ایک فنکارانہ طنز ہے۔ فساد پر منٹو نے اور بھی متعدد نہایت مختصر افسانے اور لطیفے قلمبند کیے تھے۔ انہیں محمد حسن عسکری نے "سیاہ حاشیے" کے نام سے مرتب کیا ہے۔

منٹو کے یہ سارے افسانے سیاسی اور سماجی ناہمواری، بے راہ روی اور ناانصافی پر اس کے تاثرات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان تخلیقات کا مواد اور موضوع کسی اعتبار سے انوکھا اور دوسرے فنکاروں کی تخلیقات سے جداگانہ نہیں ہے۔ ان کے متعلق منٹو کے

تاثرات بھی اس کی انفرادی شخصیت کی آئینہ داری نہیں کرتے۔ البتہ منٹو کے فن کو پرکھنے والے افسانے کی تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے ان افسانوں میں بھی منٹو کو اپنی منفرد راہ پر گامزن پائیں گے۔ لیکن منٹو کے داخلی محرکات، اس کی شخصیت کی تشکیل اور عناصر و عوامل، اس کے عجیب و غریب طور طریقوں پر یہ افسانے کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ منٹو کی شخصیت کے تجزیے میں ہم ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

منٹو کے ان بیس افسانوں کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا جو اس نے ایک دن کے وقفے پر ۱۲ر مئی ۱۹۵۴ء سے ۲ر جون ۱۹۵۴ء کے درمیان اخباروں کے دفتر میں بیٹھ کر لکھے تھے۔ یہ غیر مطبوعہ افسانے نقوش کے منٹو نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ ان افسانوں کا مطالعہ بھی ہمیں منٹو کی شخصیت کے اساس کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں پہنچاتا۔ یہ افسانے منٹو نے اپنی موت سے صرف سات ماہ قبل لکھے تھے۔ اس وقت وہ جن حالات سے گزر رہا تھا انہوں نے اس کی شخصیت کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور وہ اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا۔ مالی بدحالی اور کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے اس کی ذات ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔

حوالہ جات

I LEONARDO DE VINCI; SIGMUND FREUD, TRANSLATED BY A.A. BRILL. ROUT LEDGE AND KEGAN PAUL LTD. LONDON, 1921

II گنجے فرشتے ۔ سعادت حسن منٹو ۔ مکتبہ جدید لاہور ۔ جون ۱۹۵۲

۱۔ میرا صاحب
۲۔ آغا حشر کشمیری سے دو ملاقاتیں
۳۔ اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں
۴۔ تین گولے
۵۔ باری صاحب
۶۔ مُرلی کی دُھن
۷۔ پری چہرہ نسیم
۸۔ اشوک کمار
۹۔ نرگس
۱۰۔ بابو راؤ پٹیل

III لاؤڈ سپیکر ۔ سعادت حسن منٹو ۔ گوشہ ادب ۔ چوک انارکلی لاہور ستمبر ۱۹۵۰

۱۔ نور جہاں
۲۔ نواب کشمیری
۳۔ ستارہ

۴ - چراغ علی حسرت

۵ - پراسرار نینا

۶ - رفیق غزنوی

۷ - پارو دیوی

۸ - انور کمال پاشا

۹ - کے کے

IV - منٹو کے ادبی مضامین - سعادت حسن منٹو - اعتقاد پبلشنگ ہاؤس - اردو بازار، جامع مسجد دہلی - ۱۹۷۲

۱ - لوگ اپنے کو مدہوش کیوں کرتے ہیں ؟

۲ - ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ -

V - زحمت مہر درخشاں - ٹھنڈا گوشت - مکتبہ نو دہلی

VI - لذتِ سنگ - نیا ادارہ، لاہور

VII - سیاہ حاشیے - مختصر افسانے اور چھوٹے لطیفے - فساد کے متعلق - مرتب - حسن عسکری - مکتبہ جدید - اردو چوک - انارکلی - لاہور ۱۹۴۸

VIII - منٹو شخصیت اور فن - پریم گوپال متل - موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج - نئی دہلی - فروری ۱۹۷۲

منٹو کے منتخب افسانے

۱ - بابو گوپی ناتھ

۲ - ہتک

۳ - سو کنڈل پاور کا بلب

۴ - جانکی

۵ - ٹوبہ ٹیک سنگھ

۶ - ٹھنڈا گوشت

۷ - دھواں

۸ - ترقی پسند

۹ - ڈرپوک

۱۰ - ودوا پہلوان

۱۱ - بُو

۱۲ - کالی شلوار

۱۳ - رام کھلاون

۱۴ - ٹوٹو

۱۵ - سہائے

۱۶ - خالی بوتلیں خالی ڈبے

۱۷ - سڑک کے کنارے

IX - منٹو کے نمائندہ افسانے - اطہر پرویز - ایجوکیشنل بک ہاؤس ۔علی گڑھ ۱۹۷۷

۱ - نیا قانون

۲ - ممد بھائی

۳ - موذیل

۴ - ممی

X - منٹو کے افسانے - مشورہ بک ڈپو - دہلی

۱ - اصغر علی فوٹو گرافر

۲ - نیلم

XI - منٹو کی بہترین کہانیاں - مشورہ بک ڈپو - دہلی

۱ - پیرن

۲ - پری

۳ - نطفہ

۴ - صاحب کرامات

۵ - تقی کاتب

XII - کالی شلوار - مشورہ بک ڈپو - دہلی

۱۔ مس ٹین والا

XIII ۔ خالی بوتلیں خالی ڈبے ۔ مشورہ بک ڈپو ۔ دہلی

۱۔ کتاب کا خلاصہ

۲۔ دو قومیں

۳۔ شانتی

XIV ۔ چغد ۔ مشورہ بک ڈپو ۔ دہلی

XV ۔ ٹھنڈا گوشت ۔ ساقی بک ڈپو ۔ اردو بازار دہلی

۱۔ ساڑھے تین آنے

۲۔ شاردا

۳۔ خورشٹ

XVI ۔ سڑک کے کنارے ۔ ساقی بک ڈپو ۔ اردو بازار دہلی

۱۔ موتری

XVII ۔ سرکنڈوں کے پیچھے ۔ ساقی بک ڈپو ۔ اردو بازار، دہلی

۱۔ اللہ دتا

۲۔ بلونت سنگھ مجیٹھیا

۳۔ جاو حنیف ۔ جاؤ

۴۔ شادی

۵۔ ممی

۶۔ وہ لڑکی

۷۔ محمودہ

XVIII ۔ نقوش ۔ لاہور ۔ منٹو نمبر ۔ ۱۹۵۵

۱۔ رحم دل دہشت پسند ۔ ابو سعید قریشی

۲۔ میرا دوست میرا دشمن ۔ عصمت چغتائی

۳۔ منٹو میرا دشمن ۔ اپندر ناتھ اشک

۴۔ منٹو کی حقیقت نگاری ۔ عبادت بریلوی

۵ ۔ منٹو کی چند یادیں اور خطوط ۔ احمد ندیم قاسمی
۶ ۔ منٹو ماموں کی موت ۔ حامد جلال
XIX ۔ شاعر بمبئی منٹو نمبر ۔ مارچ و اپریل ۱۹۵۵
۱ ۔ سعادت حسن منٹو ۔ کوثر چاندپوری
۲ ۔ منٹو کی زندگی کا ایک خاکہ ۔ ادارہ شاعر